قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا ستترواں سال

ماہنامہ

# طلوعِ اسلام

جولائی 2020ء

لاہور

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

"لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ" (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



(غلام احمد پرویز کا یومِ پیدائش 9 جولائی 1903ء)













# طلوعِ اسلام کا مقصد

جو احباب طلوع اسلام سے تعارف نہیں رکھتے ان کی آگاہی کے لئے ہم طلوع اسلام کے مقصد کو وقتاً فوقتاً سامنے لاتے رہتے ہیں:

1- تنہا عقل انسانی زندگی کے مسائل کا حل دریافت نہیں کرسکتی۔ اسے اپنی راہنمائی کے لئے اسی طرح وحی کی ضرورت ہے جس طرح آنکھ کو سورج کی روشنی کی ضرورت۔

2- خدا کی طرف سے عطا شدہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے ابد تک ضابطہ ہدایت ہے۔ لہٰذا اب نہ خدا کی طرف سے کسی کو وحی مل سکتی ہے نہ کوئی نبی یا رسول آسکتا ہے۔ قرآن کریم خدا کی آخری کتاب اور حضور رسالتماب ﷺ خدا کے آخری نبی اور رسول ہیں۔

3- قرآن کریم کا ہر دعویٰ علم پر مبنی ہے اور اس کے حقائق زمان و مکان کی حدود سے ماوراء ہیں۔ قرآنی حقائق کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ جس حد تک انسانی علم ترقی کر چکا ہے وہ انسان کے سامنے ہو اور چونکہ قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ خدا نے تمام کائنات انسان کے لئے تابع تسخیر کر رکھی ہے اس لئے خدائی پروگرام کو پورا کرنے کے لئے کائناتی قوتوں کی تسخیر ضروری ہے۔

4- نبی اکرم ﷺ کی سیرتِ مقدسہ شرف و عظمت انسانیت کی معراج کبریٰ ہے۔ یہی وہ پاکیزہ سیرت ہے جو تمام نوع انسانی کے لئے اسوۂ حسنہ (بہترین نمونہ) ہے۔ حضور ﷺ کی سیرت طیبہ کا جو حصہ قرآن کریم کے اندر محفوظ ہے اس کے قطعی یا یقینی ہونے میں کسی قسم کا شک و شبہ نہیں۔ باقی رہا وہ حصہ جو قرآن سے باہر ہے سو اس میں اگر کوئی بات ایسی ہے جو قرآن کے خلاف جاتی ہے یا جس سے حضور ﷺ پر (معاذ اللہ) کسی قسم کا طعن پایا جاتا ہے تو ہمارے نزدیک وہ بات غلط ہے۔ اسے حضور ﷺ کی طرف منسوب نہیں کرنا چاہئے۔ یہی اصول صحابہ کبارؓ کی سیرت مقدسہ کے سلسلہ میں بھی سامنے رکھا جانا چاہئے۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

5- دین کا مقصد یہ ہے کہ وہ انسانوں کو دوسرے انسانوں کی محکومی سے چھڑا کر ان سے خالص قوانین خداوندی کی اطاعت کرائے۔ قوانین کی یہ اطاعت ایک نظام مملکت کی رو سے ہوسکتی ہے اس کے بغیر دین (جو نظام زندگی کا نام ہے) متمکن نہیں ہوسکتا۔

6- رسول اللہ ﷺ نے سب سے پہلے دین کا نظام قائم فرمایا۔ اس نظام میں قرآن کریم کے احکام و قوانین کی اطاعت کرائی جاتی تھی اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں، ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے امور مملکت امت کے مشورہ سے سرانجام پاتے تھے۔

7- رسول اللہ ﷺ کے بعد دین کا وہی نظام حضور ﷺ کے خلفائے راشدینؓ نے جاری رکھا۔ اس میں امور مملکت سرانجام پانے کا وہی طریقہ تھا جو

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

جولائی 2020ء

جلد 73 | شمارہ نمبر 07

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِتعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 600 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 1000 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

## اس شمارے میں


| عنوان | مصنف | صفحہ نمبر |
|---|---|---|
| لمعات: اسلام خطرے میں ہے | ادارہ | 4 |
| 1940 کا ریزولیوشن کن حالات میں پاس ہوا تھا؟ | ادارہ | 10 |
| قرآن اور شاعری | پرویزؔ | 15 |
| میری ڈائری کا ایک ورق | محمد خالد گل، سعودی عرب | 19 |
| دیت کا قرآنی مفہوم | خواجہ ازہر عباس، کراچی | 20 |
| قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں (قسط نمبر: 2) | غلام احمد پرویزؔ | 25 |
| انسانی ذات کی تخلیق | ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد | 37 |
| معاملات میں شہادت کی اہمیت | ڈاکٹر شاکر حسین خان، کراچی | 51 |
| باب المراسلات: تین طلاق | ڈاکٹر سنبل، اسلام آباد | 59 |


ENGLISH SECTION

Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2
By G. A. Parwez (Translated by: Mansoor Alam) Episode No.2 — 59

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546
Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

**Bank Account Idara Tolu-e-Islam**
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

# طلوعِ اسلام

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ وبر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دل تبریز وکابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہم سفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا
ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز وسازِ زندگی کہ دے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

# اسلام خطرے میں ہے

بیس کنال رقبہ میں تعمیر شدہ ایک وسیع وعریض، عالیشان بنگلہ کے نوکر گھروں کے ایک تنگ وتاریک کمرہ میں، سردیوں کی ایک کپکپاتی رات، ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ سخت جاڑا لیکن کمرے میں آگ تک روشن نہیں۔ گرم کپڑے ماں کے پاس نہیں تو بچے کے لئے کہاں سے آتے۔ ماں اسے چیتھڑوں میں لپیٹ کر چھاتی کے ساتھ لگا لیتی ہے کہ اسے کچھ حرارت پہنچے۔ وہ بھوک سے روتا ہے لیکن مسلسل فاقوں سے، ماں بچاری کے دودھ کے چشمے سوکھ چکے ہیں۔ بمشکل دو چار گھونٹ دودھ بچے کو مل سکا۔ وہ بلک رہا ہے۔ غمزدہ ماں کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے ہیں۔ باپ ماتھے پر ہاتھ رکھے بیٹھا ہے کہ پہلے ہی گزارا مشکل تھا اب اس مزید ذمہ داری کا بوجھ کیسے اٹھایا جا سکے گا۔

اُسی آن، سامنے بنگلہ کے ایک برق پاش کمرہ سے بھی ایک نومولود کے رونے کی پہلی آواز سنائی دیتی ہے ایک چھوڑ، دو دو لیڈی ڈاکٹرز زچہ کے سرہانے، کئی نرسیں، کمرہ میں ہر قسم کا سامان، اعلیٰ درجہ کے نرم اور گرم کپڑے۔ دودھ پلانے کو انائیں۔ اور بطور حفظ ماتقدم ولایتی دودھ کے ڈبے۔ وٹامنز کی شیشیاں اس پر مستزاد۔ چاروں طرف سے، مبارکبادیاں، شہنائیوں، مٹھائیوں کی چہل پہل ہے۔ مولوی صاحب بچے کے کان میں اذان دینے کے لئے تشریف لائے تو ایک سو ایک روپیہ نذرانہ پیش کیا گیا۔ عقیقہ ہوا تو کتنے بکرے ذبح کئے گئے۔ ختنہ کی تقریب پر شہر بھر کے امراء کی دعوت ہوئی۔

اس دوران، نوکر گھر کے تنگ وتاریک کمرے میں پیدا ہونے والا بچہ، بدستور کپڑوں کے لئے ترستا اور دودھ کے لئے بلکتا رہا۔

کیا کسی بڑے سے بڑے دانشمند کی منطق بتا سکتی ہے کہ اس غریب (مالی) کے بچے نے کیا جُرم کیا تھا جس کی اُسے یہ سزا مل رہی ہے، اور اُن خان صاحب کے صاحبزادے نے کون سا تیر مارا تھا جس کے صلہ میں اسے یہ تمام آسائشیں میسر ہیں؟ برہمن نے اس کی یہ (ابلہ فریب) توجیہہ وضع کر لی کہ یہ ان کے پچھلے جنم کے کرموں (اعمال) کا نتیجہ ہے ___ اس توجیہہ کی بنیاد غلط سہی، لیکن اس سے (کم از کم) منطقی نتیجہ تو مرتب ہو جاتا ہے یہ سب خدا کی مرضی پر موقوف ہے۔ اس نے جسے جیسا چاہا بنا دیا اور جس حالت میں چاہا رکھا۔ اس میں کسی کے لئے دم مارنے کی جا نہیں۔

وہ، یہ جواب دے کر مطمئن ہو گئے لیکن انہوں نے کبھی سوچا بھی کہ اس سے خود خدا کے متعلق کس قسم کا تصور پیدا ہوا؟ لیکن انہیں اس سے کیا غرض! لیکن ان کے اس جواب سے، خدا کا جس قسم کا تصور پیدا ہوتا ہے جو شخص اسے زبان پر لانے کی

جرأت (یا حماقت) کر بیٹھے، اس کے لئے احتساب کا ڈنڈا اور فتویٰ کا کوڑا موجود ہوتا ہے۔

پہلے تنہا مالی کام کرتا تھا۔ اب اس کی بیوی نے بھی محنت مزدوری شروع کر دی تا کہ کسی طرح روٹی کا دھندا چل سکے۔ اس دوران میں، بچہ رینگتے گھسٹتے چار پانچ سال کا ہو گیا۔ انہوں نے کسی نہ کسی طرح، اپنا پیٹ کاٹ کر بچے کو اسکول میں داخل کرا دیا۔ یہ صبح، پھٹے ہوئے (پیوند لگے) کپڑوں میں ملبوس بھوکا اسکول جاتا۔ وہاں اپنے ماں باپ کی مفلسی اور ناداری کے جرم کی پاداش میں، اپنے ہم مکتبوں کے حقارت آمیز طعنوں کا شکار، اور ماسٹر صاحب کے ڈنڈے کا ہدف بنتا۔ اس کے باوجود وہ ہمیشہ جماعت میں اوّل یا دوم آتا رہا۔

اُدھر خان صاحب کا صاحبزادہ چیفس کالج میں داخل ہوا۔ نوکر چاکر حلقہ بند، سواری کے لئے باہر موٹر، کالج میں گھوڑا، زرق برق پوشاک، اعلیٰ درجے کے کھانے، رہنے سہنے کی ہر قسم کی آسائش نہ کسی چیز کی کمی، نہ کسی بات کی محتاجی۔ اس نے پانچ سات برس انہی عیش سامانیوں میں گزارے۔ عمر بڑھی تو مشاغل کی نوعیت میں فرق آ گیا۔ ان کے لئے کالج کی فضا سازگار (یا کافی) نہیں تھی۔ کالج چھوڑ ولایت چلا گیا۔

مسلسل محنت، خوراک کی کمی، آرام کا فقدان، پریشانیوں کی بھرمار، مالی دن بدن کمزور ہوتا چلا گیا اور اس کے بعد بیمار پڑ گیا۔ گھر کھانے کے لئے نہیں تھا۔ علاج کے لئے پیسہ کہاں سے آئے وہ مختلف ہسپتالوں کے برآمدوں میں ایڑیاں رگڑتا رہا کہ کہیں داخلہ مل جائے۔ لیکن پیسے کے بغیر داخلہ کیا مل سکے۔ بالآخر ایک دن ہسپتال کے برآمدے میں جان توڑ دی ___ ایک نامراد بیوہ، دو یتیم لڑکیاں اور ایک معصوم لڑکا (جو اُس وقت آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا) ''ورثہ'' میں چھوڑے ___ گھر میں دو چار برتن تھے۔ انہیں بیچ کر تجہیز و تکفین اور درود فاتحہ کا انتظام کیا۔ لوگ مُردے کو دفن، اور اس کی عاقبت بخیر ہونے کی دعا کر کے، اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے، اور بیس لاکھ کی آبادی میں سے کسی نے اتنا نہ پوچھا کہ اب اس بیوہ اور اس کے یتیم بچوں کی زندگی کیسے گزرے گی! بڑی مشکل سے خان صاحب نے اتنا کرم کیا کہ انہیں کچھ دنوں تک کے لئے کمرے میں رہنے کی اجازت دے دی۔ اب مالی کے لڑکے کو، ماں کے ساتھ مل کر محنت مزدوری بھی کرنی پڑتی تھی۔ اس کے باوجود اس نے پڑھائی جاری رکھی۔

دو ایک ماہ گزرے تھے کہ ایک رات، اچانک خان صاحب کا انتقال ہو گیا۔ (بعض لوگوں کا خیال ہے کہ انہیں زہر دے دیا گیا تھا)۔ پانچ لاکھ کی انشورنس پالیسی، کئی مربعے اراضی، متعدد کوٹھیاں، دوملیں، نقدی، زیورات، موٹریں ترکہ میں چھوڑیں۔ صبح کو صاحبزادہ صاحب ان سب کے مالک تھے ___ اَن پڑھ، اوباش عیاش جس میں ایک پیسہ کمانے کی صلاحیت نہیں، اس کا شمار ملک کے بیس دولتمند خاندانوں میں ہو گیا ___ سرکار دربار میں ہر طرح کی عزت، حاکم، افسر ہر شام اس کی کوٹھی پر۔ دور دور تک شہرت، دو چار غنڈوں کے پشتیبان بنے۔ ایک دو سیاسی لیڈروں کے دوروں کے اخراجات کا ذمہ لیا۔ پھر ڈر کا ہے کا؟ جسے چاہا لٹوا دیا جسے چاہا پٹوا دیا۔ اُس کی لڑکی نکلوا دی۔ اس کی بہن اغواء کرا دی۔ قانون کے ہاتھ کو رشوت نے مفلوج کر رکھا تھا۔ اس لئے یہ اس کی گرفت سے مامون تھے۔ باقی رہی معاشرہ کی انگشت نمائی۔ سو اس کے لئے ہر جمعرات

کی شام داتا دربار کی حاضری۔ محلہ کی مسجد کے امام صاحب کی تنخواہ، مسجد میں قالین، پنکھے، برف، آئے دن نذر نیاز کی دیگیں۔ اولیاء کرامؒ کے عرس، پیشہ ور گداگروں کے لئے صدقہ خیرات۔ کاروباری یتیم خانوں کے لئے چندہ ___ اور پھر لندن سے واپسی پر سر راہے حج اور عمرہ اس کے بعد جوان کے خلاف انگلی اٹھائے، یہ پورا لشکر اس کی آنکھ نکالنے کے لئے تیار ہو جائے۔

❁❁❁

مالی کے لڑکے نے، دو سال کی کوشش کے بعد میٹرک کر لیا۔ ویسے تو فرسٹ ڈویژن مل گئی۔ لیکن کالج میں جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ نوکری کی تلاش شروع ہوتی۔ لیکن جس کے پاس نہ رشوت کے لئے پیسہ، نہ سفارش کے لئے رسائی ہو، اسے نوکری کہاں سے مل جائے ___ ایک ایک دروازے پر دستک دی۔ ایک ایک آستاں پر ٹھوکریں کھائیں۔ لیکن دھکوں کے سوا کہیں سے کچھ نہ ملا۔ چھ ماہ کی بھڑک پیمائیوں کے بعد، ایک دفتر میں چپراسی کی جگہ ملی۔ جگہ چپراسی کی لیکن کام، صاحب کی موٹر صاف کرنے کا، ضعیف اور بیمار ماں، دو بہنیں جن کی عمر اب شادی کے قابل ہو گئی تھی۔ ان کی ذمہ داری اور ساٹھ روپے ماہوار تنخواہ (1) ___ ہر مہینہ کی یکم کو جب اس کی ہتھیلی پر ساٹھ روپے رکھ دیئے جاتے، تو دفتر والے مطمئن ہو جاتے کہ انصاف کا تقاضا پورا ہو گیا ہے۔ جو کچھ اس کا واجب تھا اسے ادا کر دیا گیا ہے ___ یہ دیکھنا کسی کی ذمہ داری نہیں تھی کہ اس ساٹھ روپے میں، ان چار نفوس کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانے کو سوکھی روٹی بھی میسر آ سکتی ہے یا نہیں! یہ دیکھنا کسی کی ذمہ داری نہیں تھی۔

یہ لڑکا بچپن سے نماز روزے کا پابند تھا۔ جمعہ کے خطبہ میں خطیب عام طور پر دہراتا کہ خدا کی ایک صفت رزاق بھی ہے۔ وہ جسے پیدا کرتا ہے اس کے رزق کی ذمہ داری بھی لیتا ہے ___ وہ یہ سُنتا تو جی ہی جی میں سوچتا کہ اگر یہ سچ ہے کہ اپنی مخلوق کے رزق کی ذمہ داری خدا نے اپنے سر لے رکھی ہے، تو ہم بھوکے کیوں مر رہے ہیں! ہمارے معاملہ میں خدا کی یہ ذمہ داری پوری کیوں نہیں ہوتی؟ کیا ہم اس خدا کی مخلوق نہیں جو اپنی مخلوق کے رزق کا ضامن ہے؟ اس کے دل میں رہ رہ کر یہ سوالات اٹھتے لیکن اسے ان کا کوئی جواب نہ ملتا۔ وہ مولوی صاحب سے پوچھتا تو وہ اسے خشمگیں آنکھوں سے گھور کر دیکھتے اور یہ کہہ کر چُپ کرا دیتے کہ اس قسم کے سوال کرنا اللہ رب العالمین کی شان میں گستاخی ہے۔ وہ آقا ہے ہم اس کے غلام ہیں۔ وہ مالک ہے ہم اس کے بندے ہیں۔ وہ جسے جس حالت میں چاہے رکھے۔ بندوں اور غلاموں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ آقا اور مالک سے اس قسم کے سوال کریں۔ خدا اپنے بندوں کو آزماتا ہے۔ یہ دنیا لاش ہے اور اس کے چاہنے والے کتے۔ یہاں کے دولتمندوں کے لئے یہ چند روزہ مال و متاع ہے۔ عاقبت کا گھر غریبوں اور محتاجوں کے لئے ہے ___ مولوی صاحب ان مواعظِ حسنہ کے بعد خوش ہو جاتے کہ ہم نے ''مسئلہ سمجھا کر'' اسے خاموش کر دیا ہے۔ لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے سینے کی یہ آتشِ خاموش، اندر ہی اندر، کس کس چیز کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنائے چلی جا رہی ہے، اور آخر الامر، یہ ایک دن کیسا شعلۂ جوالہ بن کر

(1) یہ مضمون 1969ء کا تحریر کردہ ہے۔ 1969ء میں امریکی ڈالر 4.70 روپے کا تھا۔ اس حساب سے چپراسی کی تنخواہ 31000 روپے بنتی تھی۔ آج تو اس سے بھی زیادہ بُرا حال ہے (مدیر)

بھڑک اٹھنے والی تھی۔لیکن مولوی صاحب کو یہ کچھ سوچنے کی نہ ضرورت تھی، نہ فرصت انہیں تو بلا محنت کئے سب کچھ ملتا تھا۔

❁❁❁

اس لڑکے کی ماں کا والد فوت ہو گیا تو ترکہ میں ایک مختصر سا مکان چھوڑ گیا جو اس کے حصہ میں آیا۔ وہ خوش تھی کہ اب کچھ آمدنی میں اضافہ ہو جائے گا۔ اور عند الضرورت اسے فروخت کر کے، جوان لڑکیوں کے ہاتھ پیلے کر سکوں گی۔ لیکن مکان میں جو کرایہ دار بستا تھا اس نے اُسے کرایہ دینے سے انکار کر دیا۔ غریبوں اور بے کسوں کا یہ خاندان حیران تھا کہ یہ کیا ہوا؟ وہ مکان کا کرایہ کیوں نہیں دیتا تھا؟ انہوں نے اِدھر اُدھر لوگوں سے ہمدردی کا واسطہ دے کر، اسے کہلوایا کہ وہ یا کرایہ ادا کرے، یا مکان چھوڑ دے لیکن وہ کوئی چھٹا ہوا بدمعاش تھا۔ اس نے صاف جواب دے دیا ___ اور لوگ بھی خاموش ہو کر بیٹھ گئے کہ اس غنڈہ سے خواہ مخواہ کا بیر کیوں مول لیں! اب اس بڑھیا کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ کیا کرے ___ ایک وکیل سے مشورہ کیا۔ اس نے (خدا واسطے کام کرنے کا وعدہ کر کے) سو روپے کا ابتدائی خرچ بتا دیا۔ اس نے کہیں سے قرض اٹھا کر سو روپے دے دیئے ___ دیوانی عدالت کا مقدمہ۔ تین سال ہونے کو آئے۔ ابھی پہلی پیشی سے بات آگے نہیں بڑھی ___ اب نہ اس بچاری کی بات وکیل سنتا ہے، نہ وکیل کی شنوائی جج صاحب کی عدالت میں ہوتی ہے ___ جب تک اہلمدوں اور ناظروں کو راضی نہ کیا جائے، باب عالی تک رسائی اور شنوائی کیسے ہو؟ ایک دفعہ کوئی نیک دل، خدا ترس تحصیلدار آ گیا۔ وکیل صاحب نے کسی طرح بات ان تک پہنچائی تو اسے اس بیچاری کی حالتِ زار پر رحم آ گیا۔ اس نے اس غاصب سے مکان خالی کرانے کا کچھ بندوبست کیا۔ اُس بدمعاش نے اس کے خلاف دو چار جھوٹی درخواستیں دلوا دیں۔ مکان تو کیا خالی ہونا تھا، اُلٹا اسی بیچارے کے خلاف انکوائری شروع ہو گئی ___ فرائض شناس، دیانتدار، شریف النفس، خدا ترس، منصف مزاج افسر ہمیشہ اپنے ہم عصروں کی نگاہوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتے ہیں۔ اور وہ اس موقعہ کی تلاش میں رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اس خارِ پہلو کو نکال باہر کیا جائے۔ لہٰذا اس قسم کی شکایتوں کو سچا ثابت کرنے کے لئے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا دیتے ہیں تا کہ اسے اپنے دیانتدار ہونے کی سزا ملے اور اسی قسم کے دوسرے دیانتدار اس سے عبرت پکڑیں۔ غنیمت ہے کہ تحصیلدار صاحب سستے چھوٹ گئے اور بات تبدیلی سے آگے نہ بڑھی۔ وہ تبدیل ہو گئے اور اس غاصب کا قبضہ مخالفانہ برحق ہو گیا۔

اب وہ کرایہ دار صاحب، مکان پر قبضہ جمائے بیٹھے ہیں، اور مکان کے مالک بیٹھے اپنی قسمت کو رو رہے ہیں۔ وہ بڑھیا بچاری اب اس فکر میں ہے کہ کہیں سے پانچ روپے مل جائیں تو وہ جناتی بابا سے تعویذ لائے جس سے (اس کی پڑوسن کے کہنے کے مطابق) وہ بدمعاش کرایہ دار بھسم ہو جائے گا۔

❁❁❁

لڑکیاں جوان ہو کر (یوں کہئے کہ) بوڑھی ہو رہی تھیں اور ان کے لئے کہیں سے پیغام نہیں آتا تھا۔ ان کی جھگی کے قریب ایک نوجوان لڑکا رہتا تھا ___ کسی مل میں مستری ___ اس نے اپنی شرافت کا سکہ جما کر ان کے گھر میں آنا جانا شروع کر دیا۔

بڑی لڑکی سے اس کی شادی ہوگئی۔ شادی کے کچھ دنوں بعد وہ اچھی ملازمت کے بہانے کسی دوسرے شہر چلا گیا اور بیوی کو بھی ساتھ لے گیا۔ ایک عرصہ تک ان کی طرف سے خیر خیریت تک کی اطلاع نہ آئی۔ یہ بیچارے بہت پریشان تھے۔ جس شہر کا وہ کہہ کر گیا تھا، وہاں اس کا کوئی اتا پتہ نہ تھا۔ ایک دن ایک عورت آئی اور اُس لڑکی کا یہ خفیہ پیغام لائی کہ میرا خاوند بُری عادتوں کا شکار ہوگیا ہے۔ مجھے اس نے قید کر رکھا ہے اور بات بات پر میری ہڈیاں توڑتا ہے۔ مجھے کسی طرح اس عذاب سے نجات دلاؤ۔ چپراسی بیچارہ مصیبتوں کا مارا، وہاں گیا۔ لمبے چوڑے جھگڑے کے بعد، وہ درندہ پانچ سو روپیہ لے کر طلاق دینے پر راضی ہوا۔ اس غریب نے مرتے بھرتے کسی طرح روپے کا انتظام کیا اور مظلوم بہن کو گھر لے آیا۔ وہ کب تک بھائی کے سر پر بوجھ بنے بیٹھی رہتی۔ لیکن غریب مطلقہ سے نکاح بھی کون کرتا___ اس دوران میں اس کا وہی پہلا خاوند پھر کہیں سے آ گیا___ منت سماجت شروع کی۔ محلے کے لوگوں نے بھی اس کی تائید کی۔ وہ پانچ سو روپیہ واپس دینے پر بھی آمادہ ہوگیا۔ اس مطلقہ نے اُسے غنیمت سمجھا اور اس کے ساتھ دوبارہ نکاح کے لئے رضامند ہوگئی۔ لیکن مولوی صاحب نے فتویٰ دے دیا کہ چونکہ اسے ''تین طلاق'' مل چکی ہے اس لئے یہ اپنے سابقہ شوہر سے نکاح نہیں کرسکتی جب تک اس کا پہلے کسی سے حلالہ نہ ہوجائے۔ پوچھا گیا کہ حلالہ کیا ہوتا ہے تو انہوں نے بتایا کہ کسی اور شخص سے ایک رات کے لئے نکاح اور دوسری صبح طلاق___ پہلے تو اس کے لئے کوئی بھی آمادہ نہ ہوا لیکن جب ان سے کہا گیا کہ معاملہ ''شریعت'' کا ہے اور اس کے بغیر ان کا باہمی نکاح ہو نہیں سکتا تو وہ بیچاری سینے پر پتھر رکھ کر اس کے لئے آمادہ ہوگئی۔ اب سوال پیدا ہوا کہ حلالہ ہو کس سے؟ اس کے لئے مولوی صاحب نے کہا کہ چلئے! میں ہی اس کارِ خیر میں آپ لوگوں کی مدد کئے دیتا ہوں بشرطیکہ مجھے سو روپے ساتھ دیا جائے۔ انہوں نے یہ زہر کا پیالہ بھی پی لیا۔ مولوی صاحب نے اپنی بیوی سے رضامندی کا کاغذ لکھوایا اور ''قانون وشریعت'' کے مطابق، اس مطلقہ سے نکاح کرلیا___ نکاح کیا تھا ایک رات کے لئے لیکن مولوی صاحب کی نیت بدل گئی۔ اب وہ طلاق دینے کے لئے ایک ہزار روپیہ طلب فرما رہے ہیں۔

دوسری لڑکی کی شادی ایک رکشا ڈرائیور سے ہوئی تھی۔ وہ اپنے گھر میں خوشحال تھی۔ اس کے ہاں تین بچے ہوئے، کہ ایک شام، اس کی رکشا کو ایک تیز رو موٹر نے اٹھا پھینکا۔ حادثہ میں رکشا چکنا چور ہوگیا اور اس کا ڈرائیور وہیں ہلاک ہوگیا۔ اس کی بیوی کا اب دنیا میں کوئی نہیں تھا___ بھائی لاچار کیا کرتا۔ گیا، اور اسے تین بچوں سمیت اٹھا کر اپنے گھر لے آیا___ ایک کمانے والا (اور کمائی بھی چپراسی کی تنخواہ) اور اتنے جی کھانے والے___ اس پر مہنگائی کا یہ عالم کہ دال بھی دو روپے سیر سے کم نہ ملے۔ وہ سارا دن ملازمت کرتا۔ شام کو مختلف قسم کی محنت مزدوری کے کام کرتا۔ تب کہیں جا کر سوکھی روٹی نصیب ہوتی___ ایک دن، دفتر میں اُوپر سے ہدایات آئیں کہ بجٹ زیادہ بوجھل ہو رہا ہے اخراجات کم کئے جائیں۔ اقتصادی ماہرین کی کمیٹی بیٹھی اور انہوں نے فیصلہ کیا کہ چپراسیوں اور دفتریوں کی کچھ اسامیاں تخفیف میں لائی جائیں۔ اس چھانٹی میں یہ بھی آ گیا اور ملازمت سے چھٹی مل گئی۔

اب وہ گم صم سا رہنے لگا۔ اسے اسکول کے زمانے کا پڑھا ہوا ایک ہی شعر یاد تھا۔ وہ کبھی کبھی تنہائی میں اسے گنگنانے لگ جاتا کہ ؎

عمر اپنی جو اسی طور سے گزری غالبؔ ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خدا رکھتے تھے

ماں، قریب دو سال سے بیمار، بستر پر پڑی ہے۔ ایک بہن مولوی صاحب کے شکنجے میں جکڑی ہوئی ہے۔ دوسری بچوں سمیت اس کے ہاں اپنی قسمت کو رو رہی ہے۔ مکانؔ (جو نانا کے ورثہ میں ملا تھا) بدستور اس غاصب کے قبضہ میں ہے۔ وہ نہ اُسے چھوڑتا ہے نہ کرایہ دیتا ہے۔ یہ غریب خود ہڈیوں کا ڈھانچہ بن کر رہ گیا ہے۔ عمر بھر آٹے کی فکر سے ہی فرصت نہیں ملی جو اپنی شادی کا سوچتا ___ اور وہ اکثر کہا کرتا ہے کہ میں نے یہی کام سمجھ کا کیا ___ یا یوں کہیے کہ مجبوراً سمجھ کا ہو گیا ___ کہ میں نے اپنی شادی نہیں کی ___ اب اس میں بامشقت کام کرنے کی ہمت بھی نہیں رہی۔ لیکن مشقت نہ کرے تو اتنے نفوس کا پیٹ کیسے پالے! یہی وہ مجبوری ہے جس کی وجہ سے وہ اپنی لاش اپنے کندھوں پر اٹھائے اٹھائے پھر رہا ہے۔

❁❁❁

آزاد پارک میں جلسہ تھا۔ ایک بہت بڑے مولانا، جو اسلام کی حفاظت کے غم میں بڑے ٹھاٹھ کی زندگی بسر کر رہے تھے، دھواں دھار تقریر فرما رہے تھے۔ تان یہاں آ کر ٹوٹتی تھی کہ ___ اسلام خطرے میں ہے، سخت خطرے میں ___!

مجمع میں سے ایک آواز ابھری کہ:

مولانا صاحب! اسلام ہے کہاں جو خطرے میں ہے؟

مولانا صاحب نے چلا کر کہا کہ اُسے پکڑو۔ یہ کمیونسٹ ہے۔ لوگوں نے اسے پکڑا، تو یہ وہی مالی کا لڑکا تھا۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ کیا تم کمیونسٹ ہو؟ اس سوال سے وہ آتشِ خاموش جو ساری عمر اس کے سینے میں سلگتی چلی آ رہی تھی، آتش فشاں پہاڑ کے لاوے کی طرح پھٹ کر امنڈ آئی۔ اس نے کہا کہ میں تو ایک غریب مزدور ہوں۔ میں نے کمیونسٹ کا لفظ بے شک سنا ہے لیکن مجھے معلوم نہیں کہ وہ ہوتے کون ہیں۔ میں تو صرف اتنا جانتا ہوں کہ اسلام کا جو نقشہ یہ حضرات ہمارے سامنے کھینچتے رہتے ہیں، وہ اگر کہیں موجود ہوتا تو اسے کسی قسم کا خطرہ نہ ہوتا۔ لیکن اگر ''اسلام'' وہی ہے جس کی موجودگی میں، میری اور میرے جیسے لاکھوں مصیبت کے ماروں کی زندگی یوں گزرتی ہے، تو پھر آپ بھی سن لیں اور مولانا صاحب بھی، کہ وہ ''اسلام'' واقعی خطرے میں ہے۔ اسے ہزار مولاناؤں کے وعظ بھی نہیں بچا سکتے، کہ صحیح اسلام بھیجنے والے خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ باقی وہی بچے گا جو انسانوں کے لئے فائدہ مند ہوگا۔

وہ کچھ اور کہنے ہی والا تھا کہ کسی نے پیچھے سے آ کر اس کے کان میں کہا کہ تمہاری جھونپڑی سے رونے کی آواز آ رہی ہے۔ جلدی گھر پہنچو۔

(مطبوعہ طلوع اسلام، نومبر 1969ء)

ادارہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

# 1940ء کا ریزولیوشن کن حالات میں پاس ہوا تھا؟

23 مارچ 1940ء کی اہمیت کیا ہے، بہت کم لوگوں کو معلوم (یا کم از کم یاد) ہوگا کہ وہ حالات کس قسم کے تھے جن میں وہ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ اس کی تفصیل اسی زمانے میں ماہنامہ طلوعِ اسلام میں شائع ہوئی تھی۔ موقعہ کی مناسبت کے لحاظ سے آپ بھی اس کی ایک جھلک دیکھ لیجئے۔ طلوعِ اسلام نے لکھا تھا:

''اللہ رے بساطِ سیاست کی فسوں گرانہ مُہرہ بازیاں! مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کے انعقاد کی دھوم مچی۔ وہائٹ ہال کے اربابِ حل وعقد کی آنکھیں ایک طرف منٹو پارک (1) لاہور کی طرف لگ رہی تھیں۔ رام گڑھ (2) میں جمع ہونے والے گنگا جمنی مہاشوں کے کان دوسری طرف، ہر پتہ کھٹکنے پر کھڑے ہو رہے تھے۔ انگریز کو اپنی ساحرانہ فسوں سازیوں کی گرفت ڈھیلی ہو جانے کا خطرہ تھا۔ ہندوؤں کو رام راج کے منصوبے خواب پریشاں بنتے نظر آ رہے تھے۔ وہ متحدہ قومیت کا دامِ ہمرنگِ زمیں کہ جس کے حلقے انگریز کی ہوسِ استعمار پرستی کے ریشوں سے بٹے اور ہندو کے جذبۂ مسلم کشی کے ہاتھوں کسے گئے، تارِ عنکبوت بنتا دکھائی دے رہا تھا۔ ایک جداگانہ قوم کے لئے ایک ذرہ ذرہ اُبھرا اُبھر کر 21 مارچ کے استقبال کے لئے ہمہ تن چشم بن رہا تھا۔ ہندوستان کے ہر مسلم گھرانے میں اس تقریب کی آمد آمد پر شبِ عید کا سماں بندھ رہا تھا۔ جگہ جگہ سے خاص تیاریوں کی اطلاعات موصول ہو رہی تھیں۔ جو اس امر کی آئینہ دار تھیں کہ لاہور نو کروڑ فرزندانِ توحید کی نگاہوں کا مرکزِ جانفزا بن رہا ہے۔ غرضیکہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی تھی اور ہر دھڑکنے والا قلب محسوس کر رہا تھا کہ ہندوستان کے سمائے سیاست پر ایک آفتابِ تازہ کے طلوع کے سامان ہو رہے ہیں۔ شپرہ چشم غیروں کو اس آفتابِ جہاں تاب کی ضوفشانیوں سے جو گھبراہٹ ہو رہی تھی وہ بالکل بجا اور درست تھی۔ لیکن ملتِ اسلامیہ کی شوریدہ بختی کہ خود اپنوں میں سے بھی کچھ ایسے تھے جو اس تقریب کی کامیابی میں اپنے طرۂ امتیاز کی خمیدگی محسوس کرتے تھے۔ جو سمجھتے تھے کہ مسلمانانِ ہند کا یہ عدیم النظیر اجتماع اور اس اجتماع کے تحیر انگیز نتائج ان کے چہروں کو بے نقاب کر دیں گے، صفِ مخالف کی بھانپنے والی نگاہوں نے ان کے چہروں کی اس اُڑتی ہوئی رنگت کو دیکھا اور ایک نرم رو قاصد (3) لاہور بھیجا گیا۔ تخلیہ میں وہ ملاقات ہوئی جس کی تفصیل کے متعلق۔ کراماً کاتبین راہم خبر نیست، اجلاس کی تاریخیں قریب تر آتی گئیں۔ لوگوں کے ولولۂ شوق میں گرم جوشی بڑھتی گئی۔ تیاریاں زور پکڑتی گئیں۔ آنے والے منظر کا تصور نگاہوں میں چمک، قلوب میں مسرت آفریں تموج اور دماغوں میں کیفِ طیب پیدا کرنے لگا۔ حوصلوں نے انگڑائیاں لیں۔ ولولوں نے کروٹ بدلی۔ ہمتیں آنکھیں ملتی ہوئی بیدار ہوئیں، عزائم نے قدم بڑھایا۔ ارادوں نے کمر ہمت باندھی اور یہ قافلۂ شوق رواں دواں جادہ پیما ہوا۔

---

(1) جہاں مسلم لیگ اجلاس منعقد ہوا تھا۔ (2) کانگریس کا سالانہ اجلاس زیرِ صدارت ابوالکلام صاحب آزاد۔ (3) ابوالکلام صاحب آزاد جنہوں نے سر سکندر حیات سے ملاقات کی تھی۔

اُدھر یہ گرم جوشیاں تھیں اور اِدھر بعض چہروں کے ہلکے ہلکے، تبسم پنہاں، آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ اشارے کرتے جارہے تھے۔ لیکن کیفِ عزائم میں سرمست کاروانِ شوق کو فرصت کہاں کہ پردوں کے ارتعاشِ غیر محسوس سے منظرِ پس پردہ کا جائزہ لے لے۔ وقت گزرتا گیا۔ مہینے ہفتوں میں بدلتے گئے کہ عین شروع مارچ میں حکومتِ پنجاب کے قصرِ فلک بوس سے جماعتِ خاکساراں پر پابندیاں عائد کرنے کے احکامات نافذ ہوگئے۔ لیکن اس کاروانِ شوق نے اس پر بھی نہ سمجھا کہ:

ترے نشتر کی زَد شریانِ قیسِ ناتواں تک ہے

مہینے دنوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ خاکساروں کے خلاف پابندیوں نے فضا میں کچھ تموج پہلے سے پیدا کر رکھا تھا۔ کہ جلوسِ صدر مسلم لیگ کے عین دو روز پہلے، شام کے قریب یہ خبر آگ کی طرح اطراف واکنافِ ہند میں دوڑ گئی کہ لاہور میں خاکساروں پر گولی چلادی گئی ہے۔ تمام شہر ماتم کدہ بن گیا۔ کرفیو آرڈر جاری ہوگیا۔ دفعہ 144 نافذ کردی گئی۔ شہر پر فوج اور پولیس کا اقتدار قائم ہوگیا۔ ساری آبادی پر بلا کا سناٹا چھا گیا۔ ہر شخص ہراساں ہر متنفس متوحش، نہ باپ کو بیٹے کی خبر، نہ بھائی کو بھائی کا علم، کاروبار بند، دل پژمردہ ہمتیں پست، دل افسردہ اجلاس میں صرف ایک دن باقی رہ گیا اور لاہور کی یہ حالت! شریک ہونے والوں میں سے کچھ اپنے اپنے مقام سے روانہ ہو چکے۔ کچھ ٹکٹ بدست، اسٹیشنوں پر بیٹھے۔ کچھ راستے کے مقامات میں وقتی آرام کے لئے ٹھہرے ہوئے۔ ہر ایک حیران کہ اب کیا ہوگا۔ ہر ایک پریشان کہ اب کیا بنے گا۔ صدرِ جلسہ دہلی میں ہیں۔ استقبالیہ کمیٹی لاہور میں۔ تار پر تار آرہے ہیں۔ ٹیلیفون پر ٹیلیفون ہو رہے ہیں۔ کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ کیا کیا جائے۔ جیسا کہ مسٹر جناحؒ نے بعد میں بتایا، انہیں نہایت ''مخلصانہ'' مشورہ دیا گیا کہ اجلاس ملتوی کر دیا جائے۔ پریشانی اور دہشت کے یہ سامان ایک طرف، اور وہ عزم وہمت کا پیکر دوسری طرف کہ نامساعدتِ حالات کی تیز وتند موجیں اُٹھتی ہیں اور اس روشنی کے بلند ومحکم مینار سے ٹکرا کر خاسر ونامراد واپس لوٹ آتی ہیں۔ فی الحقیقت ایک اولوالعزم انسان کے امتحان کا اس سے زیادہ نازک موقعہ کم ہی آیا ہوگا۔ اس تدبر واستقلال کے مجسمہ نے یہ سب کچھ سنا اور دیکھا لیکن اپنے پائے ثبات میں ذرا بھی لغزش نہ آنے دی کہ وہ دیکھتا تھا کہ اگر ایسے نازک وقت میں اس کا پاؤں پھسل گیا تو مسلمانانِ ہند کے مستقبل کا آبگینۂ حیات اس کے ہاتھ سے گر کر چکنا چُور ہو جائے گا۔ اس نے ان تمام پریشانیوں کے ہجوم کو جھٹک کر الگ کر دیا اور 20 کی سہ پہر کو اعلان کر دیا کہ لیگ کا اجلاس ہوگا اور اپنے معینہ نظام الاوقات کے مطابق، بلا ردوبدل ہوگا۔ البتہ اس حادثۂ اَلم انگیز کے پیشِ نظر کہ جس نے مسلمانانِ ہند کے طرب آگیں قلوب کو کاشانہ حزن وملال بنا دیا ہے، جلوس نہیں نکالا جائے گا۔ اس اعلان کے 3 گھنٹے بعد یہ پیکرِ عزم واستقلال حسبِ انتظاماتِ سابقہ، اسپیشل ٹرین کے ذریعہ عازمِ لاہور ہوگیا۔

لاہور پہنچ کر قائدِ ملت نے کیا دیکھا؟ یہ تو ان کی چشمِ پُرنم کے آنسوؤں سے پوچھئے کہ جن کے ایک ایک قطرہ میں سینکڑوں قیامتیں تڑپتی نظر آرہی تھیں۔ البتہ دوسروں نے جو کچھ دیکھا اس سے کچھ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا ایک فرض کفایہ کی ادائیگی کے لئے لوگ اپنے آپ کو کھینچے ہوئے جانبِ قبرستان لئے جارہے ہیں۔ چہرے اُداس، دل پژمردہ، آنکھوں میں آنسو، شہر میں ہُو کا عالم۔ ہر شخص غیر محسوس خوف سے ہراساں سینوں میں آہ وفغاں کا قیامت خیز تلاطم لیکن حلق ''قانون'' کی پابندیوں کی ریشمی رسیوں میں جکڑا ہوا۔ دل الم جانگداز کی آتشِ خاموش سے سوختہ۔ لیکن لب ''آئینی'' قیود کی مصیطرانہ بندش سے سربمہر کہ

دھواں تک نہ نکلنے پائے۔ کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کے پاس نہیں جاتا کہ کوئی دیکھ نہ پائے۔ اگر کوئی ڈرتا کانپتا سہما ہوا چلا بھی گیا تو اِدھر اُدھر دیکھتا ہے کہ کوئی بھانپ تو نہیں رہا ___ کوشش کرتا ہے کہ کچھ کہے لیکن جذبات کا تلاطم اور عواقب کا خوف دامن گیر ہو جاتا ہے۔ وہ کچھ کہہ نہیں سکتا لیکن اس کی چشمِ حیرت سے ڈھلکتے ہوئے آنسو چپکے چپکے اس کے غم والم کی داستانِ خموش کا ایک ایک لفظ کہہ ڈالتے ہیں۔ سارا شہر ایک جیل خانہ معلوم ہوتا تھا کہ جہاں کا ذرہ ذرہ ایک مستقل پاسبان ہو۔ اِدھر اُدھر استقبال کے دروازے، نیم تیاریوں کی حالت میں، دو دن پیشتر کی افراتفری کے مرثیہ خواں، گری ہوئی جھنڈیاں، ٹوٹے ہوئے قطعات، یوں اِدھر اُدھر بکھرے پڑے جیسے کسی طوفانِ بلاخیز کے بعد بہہ جانے والے مکانات کے بقیہ آثار، کسی مکان سے ایک چیخ کی دردناک آواز، دو دن کے لئے ہوئے سہاگ کی داستانِ الم انگیز سے فضائے آسمانی کو ماتم کدہ بنا رہی ہے۔ کسی گھر سے ضعف ونقاہت میں ڈوبی ہوئی آہِ لرزاں، ایک پیرانہ سال بیوہ کی زندگی کے آخری سہارے کے ٹوٹ جانے کی فریاد بن کر کنگورۂ عرش کو ہلانے جا رہی ہے۔ کسی معصوم کے چہرے کی زردی اس کے تازہ داغِ یتیمی کا پتہ دے رہی ہے۔ کسی گوشے سے زخموں کے کراہنے کی صدائے دردناک اس حقیقت کی داستان سرا ہے کہ زندگی کا بوجھ ان کے لئے کس قدر ناقابل برداشت بن چکا ہے مشہدِ خاکساران کی خاک کے ذرات بیگناہ مسلمانوں کے خونِ ناحق سے رنگین قبا۔ بظاہر مرنے لیکن فی الحقیقت جینے والوں کے دمکتے ہوئے چہروں اور چمکتی ہوئی پیشانیوں کی جیتی جاگتی تصویریں۔ اور ان سب کے ساتھ، شاہی مسجد کے جنوبی مینار کہ جن کی آنکھوں نے دو دن پہلے مظلوم مسلمانوں کو تڑپتے پھڑکتے، غلطیدۂ خاک وخون، مسلح سپاہیوں کی وحشت اور درندگی اور ہوسِ خون آشامی کا شکار بن کر ذبح ہوتے دیکھا تھا، بحضور ربِ ذوالانتقام دست بدعا استادہ کہ اے خدائے رؤف ورحیم! صدقہ اس مردِ قلندر کے مقدس آنسوؤں کا جو آج ہمارے سایہ میں محوِ خواب ہے، سرزمین لاہور کو غرق ہونے سے بچالے کہ اس سرزمین کے ذرات کو اس مردِ مومن (علامہ اقبالؒ) کی کفش بوسی کی سعادت حاصل ہے جس نے تیرے بندوں کو تیرے نام پر کٹ مرنے کا بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا۔

---

ہاں یہ تھا لاہور اور یہ تھی اس کی فضا جس میں مسلم لیگ کا اجلاس شروع ہوا۔ شروع ہوا تو اس افسردگی اور پژمردگی میں لیکن دیکھنے والوں نے دیکھا کہ ایک مردِ مخلص کا یقین محکم وعملِ پیہم کس طرح نبضِ کائنات میں نئے سرے سے تموج پیدا کر سکتا ہے۔ اس کا پنجۂ جنوں طاغوتی قوتوں کی فریب کاریوں کے دلاویز نقابوں کو کس طرح تار تار کر دیتا ہے۔ اس کا حسن تدبر سیاسی گتھیوں کی پیچ در پیچ گرہوں کو کس حُسن وخوبی سے کھولتا جاتا ہے۔ 21 مارچ کی شام کو پرچم لہرانے کی مختصر سی رسم میں اس مردِ مخلص نے آکر صرف اتنا ہی کہا کہ:

> ''میں ابھی ابھی میو ہسپتال سے اپنے جگر کے ٹکڑے، اپنے زخمی بیٹوں کو دیکھ کر آرہا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ تمہاری مصیبت کس درجہ قیامت خیز ہے لیکن جذبات کے تلاطم میں نہ بہہ جاؤ مردانہ وار مقابلہ کرو۔ تم دیکھو گے کہ مظلوم کی پوری دادرسی ہوگی۔ حق وانصاف کا بول بالا ہوگا۔''

کہنے والے نے کچھ ایسا ہی کہا لیکن سننے والوں نے محسوس کیا کہ یہ الفاظ ظلمت کدۂ لاہور پر نُور کی کرنیں بن کر برسے

جنہوں نے یاس وحزن کی وحشت ناک تاریکی کا دامن چاک کر کے چاروں طرف شعاعِ اُمید دوڑا دی۔ دلوں میں پھر سے حرکت محسوس ہوئی۔ نگاہوں میں از سرِ نو روشنی پیدا ہوگئی۔ افسردہ چہروں پر خونِ نو کے کچھ کچھ آثار نظر آنے لگے۔ در و دیوار سے زندگی کے نقوش پھر سے ابھر کر سطح پر دکھائی دینے لگے۔ تھوڑے ہی عرصہ کے بعد کرفیو آرڈر کے انسانیت سوز بھیانک عفریت کے ٹکڑے فضائے آسمانی میں منتشر دکھائی دینے لگے۔ اجتماعات پر جو پابندیاں عائد ہو چکی تھیں۔ ان کی رسیاں ڈھیلی ہوگئیں۔ شہر والوں کے دلوں سے پھر سے خوف و ہراس کے تب دق کے جراثیم دور ہوئے۔ قبرستان کے سے خاموش گلی کوچے پھر سے زندہ انسانوں کی بستیاں معلوم ہونے لگیں۔ پنڈال کی رونق بڑھی۔ لوگوں کی آمد و رفت شروع ہوئی۔ دوسرے دن (22 مارچ) بعد دوپہر کے پہلے کھلے اجلاس میں کم از کم پچاس ہزار کا مجمع تھا۔ نواب سر شاہنواز خان صاحب، صدر استقبالیہ کمیٹی نے اپنا خطبہ صدارت پڑھا۔ یہ خطبہ حسبِ دستور پہلے سے چھاپ رکھا تھا۔ لیکن قدرت کا تماشہ دیکھئے کہ کسی کو یاد نہ رہا کہ اس میں سے وہ حصہ خارج کر دیا جائے جو خواہ مخواہ سرود بہ مستاں یاد دہانی بن جائے گا۔ پڑھتے پڑھتے حکومتِ پنجاب کے ''درخشندہ'' کارناموں کا ذکر آیا تو 19 مارچ کے حادثہ محزنہ کی یاد نے لوگوں کے دلوں میں ایک تلاطم پیدا کر دیا اور پنڈال نفرین ولعنت کے تہلکہ انگیز نعروں سے گونج اٹھا۔ مسلمانانِ لاہور نے تین دن سے جن جگر گداز جذبات کو اپنے سینوں میں دبائے رکھا تھا، آج وہ پوری آزادی کے ساتھ باہر آ گئے۔ مغموم دلوں کی وہ آتشِ خموش جو اتنے دنوں سے بایں نمط اندر ہی اندر سلگ رہی تھی کہ اس کا دھواں تک بھی اُوپر نہ اٹھنے پائے اس وقت اپنی پوری عناں تابی سے بھڑک اٹھی۔ یہ مظاہرہ محض رسمی نہ تھا کہ حلق کے اُوپر سے آوازیں اٹھ رہی ہوں۔ یہ تو عمق قلب سے نکلی ہوئی آہیں تھیں۔ جنہیں سن کر جگر خون ہو کر آنکھوں کے راستے بہ نکلنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سب کچھ سامنے تھا اور چشم فلک، عبرت و موعظت کے اس دلدوز منظر کو حیران و ششدر دیکھ رہی تھی کہ اللہ اکبر! یہ کیا انقلاب ہے؟ اس کے بعد ہوا کا رُخ بدل گیا۔ اس خوف و ہراس کا ردِعمل جس نے چار روز سے خطۂ لاہور کو وحشت کدہ بنا رکھا تھا، پورے جوش و خروش کی صورت میں رونما ہوا۔ گوشے گوشے سے ''مردہ باد'' کے نعرے سنائی دینے لگے۔ گلی کوچے سے لعنت و ملامت کی آوازیں اُٹھنی شروع ہوگئیں۔ اس کا انتظام تو کر لیا جا سکتا تھا کہ یہ چیزیں لاہور سے باہر کی دنیا تک نہ جانے پائیں لیکن اس کا کیا علاج کہ ملک کے گوشے گوشے سے آئے ہوئے مسلمانوں نے ان باتوں کو اپنے کانوں سے سنا۔ اور اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اس کے بعد تو رنگ ہی بدل گیا۔ کوئی جلسہ ایسا نہ تھا جس میں نفرت و ملامت کے نعرے بلند نہیں ہوتے تھے۔ کوئی اجتماع ایسا نہ تھا جس میں خونِ شہداء کی قیمت کا مطالبہ نہیں کیا جاتا تھا۔ سبجکٹ کمیٹی میں پانچ پانچ گھنٹے تک بحث رہی تو اسی مسئلے پر، کھلے اجلاس میں ہر دس منٹ کے بعد تقاضا ہوا تو اسی کا۔ دو دن تک یہ ہی مطالبہ ہر شخص کی زبان پر تھا۔ اس ہنگامۂ بحث و جدل، اس سیلابِ جوش و خروش میں مسٹر جناحؒ نے جس ہمت استقلال، عزمِ راسخ، تدبر، صلاحیت ضبط و انضباط کا ثبوت دیا۔ آنے والا مؤرخ جب اسے دیکھے گا تو بلا تأمل پکار اٹھے گا کہ فی الواقعہ ایک ''قائداعظم'' کو ایسا ہی ہونا چاہئے۔ مبارک ہے وہ قوم جسے ایسا ''رہبرِ فرزانہ'' مل جائے اور مستحق صد تحسین ہے وہ

انسان جسے مبداءِ فیض کی کرم گستری سے یہ نعمتیں یوں فراواں نصیب ہوجائیں۔ کامل دو دن تک یہ ہی ہنگامہ رہا اور بالآخر 23 کی شب آخری کھلے اجلاس میں جب کہ پنڈال میں کم از کم ایک لاکھ کا مجمع ہوگا۔ مجمع کیا جوش وجذبات کا بحرِ متموج جو ہر متصادم عنصر کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جانے کے لئے کف بردہان موجزن تھا۔ ایسے وقت میں خاکساروں کے حادثہ فاجعہ کے متعلق ریزولیوشن پیش کرنا۔ اسی صاحب ہمت، مردِ دانا کا کام تھا جسے اللہ نے اس پیرانہ سالی میں وہ جرأت وحوصلہ دیا ہے جو نوجوانوں کو بھی شرمادے۔ صاحبِ صدر (قائداعظمؒ) نے اس ریزولیوشن کو پیش کیا اور اس درد واثر میں ڈوبی ہوئی تقریر کے ساتھ جس کے لفظ لفظ سے اس کے قلبِ محزوں کی تڑپ اور خلش اُبلتی نظر آرہی تھی۔ ریزولیوشن پیش کیا اور ایک لاکھ کے مجمع میں ایک متنفس بھی ایسا نہ تھا جس نے اس کی مخالفت میں ایک آواز بھی اُٹھائی ہو۔ صاحبِ صدر نے پوچھا کہ کیا یہ چاہتے ہو کہ اس پر کھلے اجلاس میں بحث وتمحیص ہو۔ لیکن سب نے کہا کہ ہمیں اس کی ضرورت نہیں۔ اس سے اندازہ فرمایئے کہ مسلمانوں کو اپنے اس ملی راہنما پر کس قدر اعتماد ہے۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَآءُ ط (62:4)

لیگ کے اجلاس کی ابتداء اور اختتام میں کیفیات وجذبات کا جو نمایاں فرق سامنے آیا اس سے یہ چیز بالکل نمایاں تھی کہ اب مسلمانوں میں کس قدر بیداری ہوچکی ہے اور مسٹر جناحؒ کی عظمت کس قدر عوام کے دلوں میں گھر چکی ہے۔

---

یہاں تک ہم نے جو کچھ لکھا وہ اس خون کی ہولی سے متعلق تھا جو 19 مارچ کو لاہور میں کھیلی گئی لیکن مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی اہمیت صرف اس لئے نہیں کہ اس میں قیامت خیز سانحہ کے نتائج وعواقب کو حسن وخوبی سے سنبھالا گیا۔ لیگ کا یہ اجلاس فی الحقیقت مسلمانانِ ہند کی ملی زندگی میں ایک تاریخی اجلاس تھا اور ہم تو یہ کہیں گے کہ وہ خوش نصیب مسلمان جنہوں نے اس اجلاس کو بچشمِ خویش دیکھا ہے وہ محسوس کریں گے، کہ انہوں نے ان چار دنوں میں ایک قوم کی پوری تاریخ کو اپنے سامنے چلتے پھرتے دیکھ لیا۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک فلم تھا جس میں پہلے یہ دکھایا گیا کہ ایک قوم جب طاغوتی طاقتوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوتی ہے تو اس پر کس قدر افسردگی چھا جاتی ہے۔ اس کے قوائے عملیہ کس قدر مضمحل ہوسکتے ہیں۔ اس کا دل آرزوؤں اور ولولوں کا نشیمن ہونے کے بجائے حزن ویاس کا کاشانہ بن جاتا ہے۔ لیکن اس کے بعد جب اس قوم میں ایک رہبر فرزانہ پیدا ہوجائے تو وہ کس طرح پوری کی پوری فضا کو بدل کے قوم کے عروقِ مردہ میں نیا خونِ زندگی دوڑا دیتا ہے۔ مسلم لیگ کے متعلق آج تک یہ کہا جاتا تھا کہ بالآخر اس کے سامنے پروگرام کیا ہے۔ اس کی تگ ودو کا منتہیٰ کیا ہے۔ اس کے سامنے نصب العین کونسا ہے؟ لاہور کے اجلاس نے واضح اور بین الفاظ میں بتادیا کہ مسلم لیگ کا نصب العین کیا ہے! ہم ایک عرصہ سے لکھتے چلے آرہے تھے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی گتھیوں کا حل اس کے سوائے اور کچھ نہیں کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے انہیں دوسرے حصہ ملک سے الگ کرکے، ایک جداگانہ حکومت قائم کی جائے صدرِ مسلم لیگ، مسٹر جناح گذشتہ دو برس سے جس نہج سے قدم اٹھاتے چلے آرہے تھے، دیکھنے والی آنکھیں اچھی طرح دیکھ رہی تھیں کہ ان کی منزلِ مقصود کیا ہے!۔

# قرآن اور شاعری

## شاعری کیا ہے:

آپ نے دیکھا ہے کہ مخالفین حضور ﷺ کے متعلق یہ بھی کہتے تھے کہ آپ ﷺ ایک شاعر ہیں اس لئے آپ ﷺ جو کچھ کہتے ہیں وہ حقیقت پر مبنی نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس پر سنجیدگی سے غور کیا جائے۔ قرآن کریم نے اس کی تردید کی اور فرمایا کہ:

وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِيْ لَهٗ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ وَّقُرْاٰنٌ مُّبِيْنٌ ۝ (36:69)

اور (دیکھو) ہم نے محمد (ﷺ) کو شاعری نہیں سکھائی اور نہ ہی شاعری اس کے لئے مناسب ہوسکتی ہے یہ (کتاب) اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ (پیامِ حق کی) یاددہانی واضح قرآن ہے۔ یعنی یہ کہ آپ شاعر نہیں اس لئے کہ شاعری ایک پیغمبر کی شایانِ شان ہی نہیں۔ اس سے بظاہر مترشح ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے شعروشاعری کی سخت مخالفت کی ہے اور اسے مسلک پیغمبری کے خلاف قرار دیا ہے۔ قرآن کی آیات سے یہ استنباط وضاحت طلب ہے۔

زبان، اظہار مدعا کا ذریعہ ہے اور نوع انسانی کے لئے بہت بڑا امتیاز۔ اس اظہار مدعا کے لئے انسانوں نے دو انداز اختیار کئے ہیں۔ ایک تو وہ جس میں روزمرہ باتیں کرتے ہیں۔ اسے نثر کہتے ہیں، دوسرے شعر، شعر کیا ہے؟ نثر کے الفاظ کو ایک خاص ترتیب میں رکھ دیا جاتا ہے اس اعتبار سے نثر اور نظم، الفاظ کی ترتیب کے دو مختلف اسلوب ہیں۔ قرآن کریم جو زندگی کے حقائق پیش کرتا ہے ایسی نیچی سطح پر نہیں اتر سکتا کہ ان دو اسالیب بیان میں سے ایک کی ایسی مذمت کرے کہ وہ کسی بلند شخصیت کے شایان شان ہی نہ رہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے یہ کہا ہے کہ شاعری رسول کے شایانِ شان نہیں تو اس سے مقصود الفاظ کی وہ خاص ترتیب نہیں جس سے شعر موزوں ہوجاتا ہے بلکہ ایک خاص نفسیاتی کیفیت ہے۔

## شاعر کی نفسیات:

جسے اس نے ''شاعری'' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیت یا مسلک حیات کیا ہے؟ اس کی قرآن نے خود ہی دوسرے مقام پر تشریح کردی ہے۔ قرآنِ کریم کی بنیادی تعلیم یہ ہے کہ انسانی زندگی کا ایک خاص نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول اس کی تمام جدوجہد کا مقصود۔ بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ اس کے نزدیک سفر زندگی میں منزل کی تعیین کا نام ہے ایمان، اور اس منزل تک پہنچنے کی کوششوں کا نام اعمال صالحہ، یہ ایمان اور عمل کی زندگی اس کے نزدیک انسانیت کی زندگی ہے۔ لہٰذا ایک مومن کی زندگی اور رسول کے شایان شان اسلوب حیات۔ اس کے برعکس ایک دوسرا اسلوب زندگی ہے جس میں نہ انسان کی آنکھوں کے سامنے صحیح نصب العین ہوتا ہے نہ دل میں اس نصب العین کے حصول کی تڑپ اس کے جذبات اس کا معبود ہوتے ہیں اور ان کی تسکین اس کی زندگی کا منتہیٰ۔ یہ جذبات اس کی ناک (1) میں نکیل ڈالے اسے زندگی کی مختلف شاہراہوں پر ادھر ادھر لئے پھرتے ہیں۔ کبھی تصورات کی ان

حسین وادیوں میں کبھی تخیلات کے اُن نگاہ فریب مناظر کی طرف، چونکہ زندگی کا نصب العین متعین نہیں ہوتا اس لئے آج جذبات کی رو میں کچھ کہہ رہے ہیں کل کچھ اور جس قسم کا جذبہ دل میں موجزن ہوا اسی قسم کی آواز زبان پر آ گئی۔ چونکہ جذبات کے اظہار کے لئے شعر کی زبان زیادہ موزوں سمجھی گئی ہے اس لئے جذبات پرستی کی اس نہج زندگی کا نام قرآن نے شاعری رکھا ہے جو ایک مومن کی زندگی کے بالکل برعکس زندگی ہے۔ یہ دو مختلف اسالیب حیات ہیں جن کا تقابل قرآن نے ان الفاظ میں کیا ہے۔

وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿۲۲۴﴾ اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿۲۲۵﴾ وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۲۲۶﴾ (26:226-224)

اور شاعروں کی پیروی ہمیشہ گم کردہ راہ لوگ کیا کرتے ہیں۔ (اے پیغمبر!) تم نے دیکھا نہیں کہ وہ (روز) ہر (نئی) وادی میں بھٹکتے پھرتے ہیں؟ اور یہ کہ یہ لوگ وہ باتیں کہتے ہیں جو خود کرتے نہیں ہیں؟

یعنی نہ ان کے فکر کا صحیح مرکز متعین ہے اور نہ ان کے قول اور عمل میں تطابق یہ ہے نفسیاتِ شاعر اور وہ اسلوبِ حیات جس کی خصوصیت پریشانی فکر و نظر، آوارگی قلب و نگاہ اور فقدان عمل و کردار ہے اس کے برعکس ایک دوسرا اندازِ حیات ہے جس میں زندگی کا نصب العین متعین ہے اور انسان کا ہر قدم اس نصب العین کی طرف اٹھتا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَذَكَرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا ؕ وَسَيَعْلَمُ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اَيَّ مُنْقَلَبٍ يَّنْقَلِبُوْنَ ﴿۲۲۷﴾ (26:227)

(وہاں) سوائے ان لوگوں کے جو (پیغامِ حق پر) یقین لے آئے ہیں اور جنہوں نے نیک کام کئے اور اللہ کو بہت یاد کیا اور اس کے بعد کہ ان پر ظلم کیا جا چکا انہوں نے اپنی مدافعت کی (یہ لوگ ایک متعین راستہ پر چلنے والے اور گفتار و کردار میں یکساں ہوتے ہیں) اور جن لوگوں نے (ان پر) ظلم کیا ہے وہ بہت جلد معلوم کر لیں گے کہ کس منزل کی طرف وہ پلٹ رہے ہیں۔

سورۂ شعراء کی ان آیات کے دونوں حصوں کو ایک مرتبہ پھر دیکھئے ان کے درمیان جو اِلَّا (مستثنیٰ) آیا ہے اس سے یہ مراد نہیں کہ ''مسلم شعراء'' ہدایت و سعادت کی راہ پر ہیں اس لئے قرآن کے نزدیک محبوب و مرغوب اور ''غیر مسلم شعراء'' ضلالت و غوایت پر ہیں اس لئے مغضوب و مبغوض، مفہوم اس سے یہ ہے کہ جو لوگ اوّل الذکر انداز زندگی اختیار کئے ہوئے ہیں وہ غلط روش پر جا رہے ہیں۔ لیکن جو دوسرا انداز اختیار کئے ہیں وہ صحیح راستے پر چل رہے ہیں۔ قرآنی اندازِ زندگی اختیار کرنے والا اپنے مدعا کا اظہار نظم میں بھی کرے تو جائز اور درست۔ غیر قرآنی اسلوب حیات اختیار کرنے والا اپنا مفہوم نثر میں ادا کرے تو بھی غلط۔ قرآن اسالیب زندگی سے بحث کرتا ہے نہ کہ طرق اظہار مدعا سے۔ لہٰذا قرآن نے جب ''شاعری'' کو غوایت کی راہ کہا ہے تو اس سے مفہوم ہے کہ وہ نفسیاتی کیفیت ہے جو انسان کو غلط روش زندگی پر لے جاتی ہے اور فکر و عمل کی دنیا میں کہیں کا نہیں رکھتی۔ یہی وہ ''شاعری'' ہے۔

---

(1) اَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ ؕ (45:23، 25:43) (اے پیغمبر! ﷺ) تم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا جنہوں نے اپنے خیالات ہی کو اپنا معبود بنا لیا ہے

## مسلمان شاعروں کی قوم بن چکی ہے:

جو ایک مدت سے مسلمانوں کے ہر شعبہ حیات پر مستولی ہے اور ان کی کسی کوشش اور تحریک کو بار یاب نہیں ہونے دیتی۔ اگر ان کی باتیں سنئے تو ایسا معلوم ہوگا گویا ایک سیلاب امنڈتا چلا آرہا ہے جو دنیا کی ہر قوت کو خس وخاشاک کی طرح بہا کر لے جائے گا اور جب عمل کی طرف آئے تو یہ حالت کی ادنیٰ سے ادنیٰ چوکھٹ پر بھی سجدہ ریزی کر لئے تیار۔ اجتماعات قومی میں ان کے ریزولیوشنز کے الفاظ سے ان کے عزائم اور انہیں ان کے کردار کے ترازو میں تولئے تو ایک پرکاہ ثابت ہوں گے جسے ہوا کا ہلکا سا جھونکا اڑائے اڑائے پھرے۔ جذبات کی شعلہ مزاجی کا یہ عالم کہ ذرا سے اختلاف پر نعل برآتش ہو جائیں گے لیکن عدم استقلال کی یہ کیفیت کہ بگولے کا سا یہ تمام رقص و وجد اور جوش وخروش آن کی آن میں خاک نشیں ہو جائے گا۔ یہ تو ہے دنیائے عمل واستقامت میں ان کی حالت۔ دوسری طرف پریشانیٔ فکر ونظر کا یہ عالم کہ ہر ٹولی کا قبلۂ مقصود الگ اور ہر گروہ کا کعبۂ مدعا جداگانہ۔ چار اس کے پیچھے مصروفِ دشت پیمائی۔ دس اس کے ساتھ مشغول صحرا نوردی۔ ہر گروہ ''فِیْ کُلِّ وَادٍ یَّہِیْمُوْنَ﴿۲۲۵﴾'' (26:225) کی عبرت ناک تصویر اور ہر جماعت ''یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ﴿۲۲۶﴾'' (26:226) کا تاسف انگیز مرقع اور اس طرح پوری کی پوری قوم اس ''شاعری'' کا عملی پیکر جس کی قرآن نے یوں مذمت کی ہے، لیکن بایں ہمہ یوں فریب میں مبتلا کہ یہ مذمت دوسروں کی کی گئی ہے ہماری نہیں، اس لئے کہ ہم تو ''اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ'' (26:227) کے استثناء میں آگئے ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار بادا کہ افتاد است از بام بلندے

مفہوم: خدا اس سخت جاں کا دوست ہو، کہ یہ بہت اونچی چھت سے گرا ہے۔ (س۔ا)

آیۂ زیر نظر کے آخری ٹکڑا پر ایک مرتبہ پھر نگاہ ڈالئے اور دیکھئے کہ وہ صاحبِ ایمان وعمل گروہ کو فقط باتیں بنانے والوں سے کس طرح متمیز کر کے رکھ دیتی ہے، بایں نمط کہ کسی دیکھنے والے کو ان میں امتیاز کی دشواری ہی پیش نہ آئے۔ دونوں گروہ، ایک دوسرے سے الگ کھلے کھلے اور واضح طور پر متمیز۔ اس گروہ کی خصوصیات میں فرمایا کہ:

1۔ وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا (33:21) وہ اللہ کا ذکر کثرت سے کرتے ہیں۔

2۔ وَّانْتَصَرُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا (26:227)

جب ان پر کسی طرف سے دراز دستی ہو تو وہ اس کی مدافعت کرتے ہیں۔

3۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ: وَسَیَعْلَمُ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْٓا اَیَّ مُنْقَلَبٍ یَّنْقَلِبُوْنَ﴿۲۲۷﴾ (26:227)

ظلم کرنے والوں کو فوراً نظر آجاتا ہے کہ ان کا کیا حشر ہونے والا ہے۔

''اللہ کا ذکر'' کس طرح کیا جاتا ہے، اس کی تفصیل، معارف القرآن، جلد سوم (عنوان بنی اسرائیل) میں گذر چکی ہے جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ اس سے مراد ''خانقاہوں کی تنگ وتاریک کوٹھڑیوں میں، سر بزانو، ہزار ہزار دانوں کی تسبیح پر زبان سے اللہ کا نام دہراتے رہنا اور عملاً ہر طاغوتی قوت کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر قانع رہنا نہیں بلکہ دنیا سے غیر خدائی قوتوں کے غلبہ واستیلاء کو

مٹا کر اس کی جگہ حکومتِ خداوندی کو قائم کرنا۔'' اس کی عملی تفسیر یوں ہوگی کہ دنیا میں جہاں کہیں جور و تعدی اور ظلم و ستم برپا کرنے والی سرکش قوتیں سر اٹھائیں گی، ''اللہ کا ذکر'' کرنے والے مجاہدین اٹھیں گے اور حق و صداقت اور عدل و انصاف کی مدافعت میں، ہتھیلیوں پر سر لئے میدانِ عمل میں نکل آئیں گے اور ان طاغوتی قوتوں کو کیفر کردار تک پہنچا دیں گے۔ یہ ہے نشانی اس جماعت کی جسے قرآن نے ''شاعروں کے گروہ'' کے مقابلہ میں امتیازی طور پر پیش کیا ہے۔ اب آپ خود اندازہ لگا لیجئے کہ قرآن کی زبان میں ''شاعر'' کسے کہتے ہیں اور وہ کیوں اس قابل نہیں کہ اس کی اتباع کی جائے۔ مومن شاعری نہیں کرتا۔ کام کرتا ہے۔

مابمیداں سر بجیب، او سر بکف

مفہوم: ہم میدانِ (جنگ) میں اپنے گریبان میں سر جھکائے (محوِ فکر) ہیں جب کہ وہ (مومن) اپنے سر کو ہتھیلی پر رکھے ہوئے ہیں۔ (س۔ا)

اس کی تو شان یہ ہے کہ ؎

جان او پائندہ تر گردد ز موت — بانگ تکبیرش بروں از حرف و صوت
پادشاہاں در قباہائے حریر — زرد رو از سہم آں عریاں فقیر
کارِ ما وابستۂ تخمین و ظن — او ہمہ کردار و کم گوید سخن!

اس لئے

محرم او شو ز ما بیگانہ باش — خانہ ویراں باش و صاحب خانہ باش

مفہوم: اس کی زندگی کو موت سے ہمیشگی ملتی ہے اور اس کی تکبیر الفاظ اور آواز سے ماورا ہوتی ہے۔
وہ بادشاہ جنہوں نے ریشمی قبائیں زیب تن کی ہوتی ہیں اس عریاں فقیر کے سامنے سہم کر زرد رُو لگتے ہیں۔
ہمارا کام تخمینہ اور قیاس تک محدود ہے جبکہ وہ مجسم کردار ہے اور باتیں بہت کم کرتا ہے۔
اس (کردار کے حامل مومن) کا محرم بن جا اور مجھ جیسے (بے عمل) سے بے گانہ ہو جا۔ یہ بظاہر خانہ ویرانی اصل میں صاحبِ خانہ بن جانا ہے۔

## سانحہ ارتحال

ڈاکٹر شاکر حسین صاحب نے اطلاع دی ہے کہ آج بروز جمعۃ المبارک 22 مئی 2020ء کیپٹن (ر) محمد صدیق احمد بھی چل بسے۔ اللہ رب العلمین قرآن مجید کے لئے کی گئی خدمات کو شرفِ قبولیت عطا فرما کر ان کے درجات بلند فرمائے اور ان کے لواحقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین
مرحوم نے اپنے سوگ واران میں ایک بیوہ، ایک بیٹی اور تین بیٹے چھوڑے ہیں۔ زندگی بھر جھوٹ، رشوت، فرقہ پرستی کی مذمت کرتے رہے۔ ان کی تصانیف میں، ربوٰی، جنگ احد کا قرآنی نقطۂ نظر، قرآن الحکیم کی قرآنی تحریف، حدیث کتاب اللہ نہیں، کے علاوہ ایک سیرت کے متعلق کتاب زیر طبع ہے۔

محمد خالد گل، سعودی عرب

# میری ڈائری کا ایک ورق

محترم پرویزؒ صاحب جب عمرہ کرنے کے لیے سعودی عرب تشریف لائے تو میں اس وقت سعودی عرب میں مکین تھا۔ انہوں نے پہلے ہی مجھے اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا اور وہاں کے تمام انتظامات مجھے سونپ دیے تھے۔ محترم پرویزؒ صاحب کے قیام کے دوران یوں تو ان کے ساتھ گزرا ہوا ہر لمحہ تحریر میں آنا چاہئے لیکن یہاں میں صرف ایک واقعہ ہی تحریر کروں گا۔ یہ وہ واقعہ ہے جو میرے دِل پر نقش ہے اور جسے میں کبھی نہ بھلا سکوں گا۔

مکہ کے بہترین ہوٹل میں ایک چھوٹا سا قافلہ پرویزؒ صاحب کے ہمراہ ٹھہرا ہوا تھا جس میں محترم محمد عمر دراز صاحب کی فیملی ور چند دوسرے احباب جو کویت سے تشریف لائے ہوئے تھے شامل تھے۔ ہم سب نے عمرہ کیا طواف کے دوران پرویزؒ صاحب اُن آیات کا ترجمہ پڑھتے رہے جو دعا حضرت ابراہیمؑ نے تعمیر کعبہ کے وقت کی تھی۔ عمرہ مکمل ہوا تو مکہ شہر دیکھنے کے لیے نکلے۔ حضور ﷺ کی پیدائش کی جگہ پر آپ دو مرتبہ گئے۔ مسجد بلال دیکھی، غارِ حرا دیکھنے گئے، پھر انہوں نے عرفات اور منیٰ کا میدان دیکھنے کے لئے کہا وہاں مسجد نمرہ میں گئے وہ سارا وقت انتہائی خوشگوار موڈ میں رہے وہاں سے واپس آرہے تھے تو انہوں نے فرمایا: ''بھئی موقع اچھا ہے۔ لگے ہاتھ ان تین شیطانوں سے بھی ملاقات کراتے چلو جو یہاں کے مکین ہیں۔'' میں نے گاڑی کا رُخ اُدھر کر لیا وہاں کافی دیر رُکے، تصویریں بنوائیں اور ہمیں اُن تینوں شیطانوں کے بارے میں اُن کی اصل حقیقت سے آگاہ کیا۔ اس دوران شام ہو چکی تھی، ہم واپس ہوٹل آ گئے، کھانا کھایا، تھکاوٹ کی وجہ سے سب احباب اپنے اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں پرویزؒ صاحب کو اُن کے کمرے تک چھوڑنے گیا تو مجھے اندر بُلا لیا خود بستر پر لیٹ گئے میں سامنے صوفے پر بیٹھ گیا۔ بہت دیر مجھ سے باتیں کرتے رہے۔ میں ہمہ تن گوش رہا۔ مجھے یکدم خیال آیا، میں اٹھا اور ان کے پلنگ کے پاس بیٹھ گیا اور کہا آپ آج بہت پیدل چلے ہیں، تھک گئے ہوں گے؟ میں آپ کی ٹانگیں دبا دُوں۔ یہ کہنا تھا کہ انہوں نے فوراً ٹانگیں سمیٹ لیں اور اُٹھ کر بیٹھ گئے کہنے لگے نہیں نہیں، میں بالکل تھکا نہیں۔ میں اپنے کمرے میں آ گیا اور پھر بہت دیر تک اپنے اس عظیم استاد کے بارے میں سوچتا رہا جو کسی سے اپنی خدمت کروانے کو بہت ناگوار سمجھتے تھے۔ وہ یقیناً اُن استادوں سے مختلف تھے جو اپنے شاگردوں سے حقے کی چلمیں بھروانا اپنا حق سمجھتے ہیں وہ واقعی ایک عظیم انسان تھے۔

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

## چیف جسٹس پاکستان کی خدمتِ عالیہ میں گذارش

# دیت کا قرآنی مفہوم

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین نے خود ہی رہبانیت شروع کی تھی۔ ہم نے ان کے لئے رہبانیت فرض نہیں کی تھی اور پھر وہ اس کو نبھا بھی نہیں سکے 57:27۔ قرآن کریم نے اوّل دن سے رہبانیت کی مذمت کی اور اللہ کی اطاعت کو ایک نظام کی اطاعت سے وابستہ کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے نبوت کے شروع میں ہی اسلامی نظام کے قیام کی کوششیں کیں، اپنے سامنے نظام قائم فرمایا اور اس نظام کی اطاعت کو عبادت خداوندی قرار دیا۔ اگر عبادت خداوندی اسلامی نظام کے ذریعے نہ ہوتی تو حضور ﷺ اس قدر جدوجہد کر کے نظام کیوں قائم فرماتے۔ حضور نے 82 لڑائیاں مشرکین سے لڑیں لیکن نظام قائم کر کے چھوڑا۔ دوسری غور طلب بات یہ ہے کہ اگر عبادت خداوندی نظام کے ذریعے نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ اولوالامر کی اطاعت کو فرض قرار نہ دیتا۔ قرآن کی رُو سے اولوالامر کی اطاعت اسی طرح فرض ہے جس طرح رسول کی اطاعت فرض ہوتی ہے۔ اولوالامر کی اطاعت کے بغیر رسول کی اطاعت نہیں ہوسکتی ہے۔ اِس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اصل چیز نظام کی اطاعت ہے۔ لیکن خلافت راشدہ کے بعد سے ہم سب مسلمان رہبانیت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ رہبانیت صرف جنگلوں، پہاڑوں، ویرانوں میں پرستش کرنے کا نام نہیں ہے۔ قرآن کی رُو سے، اسلامی نظام کو نظر انداز کر کے، براہِ راست اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کرنا اور انفرادی نجات طلب کرنا، رہبانیت ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت نہیں ہے۔ چلوں پر نکل پڑنا، اور ہر طرح کی پرستش رہبانیت میں شامل ہوتی ہے۔ ہمارا سارا فقہ ہمارے علماء کرام اور فقہا عظام کی ذاتی آراء ہیں۔ یہ فقہ کسی اسلامی مملکت کا جاری کردہ نہیں ہے، اس لئے یہ نہ اسلامی ہے اور نہ اس کی اطاعت فرض ہے۔ اسلامی مملکت کا Constitution صرف قرآن ہوتا ہے۔ مملکت کا سربراہ اور قانون ساز ادارے خود قرآن سے قوانین استنباط کرتے چلے جاتے ہیں۔ اور ان قوانین کی اطاعت عبادت خداوندی ہوتی ہے۔ ان قوانین کا اطلاق اُن ہی کے دور تک ہوگا، آئندہ کی نسلوں کے لئے ان کی اطاعت فرض نہیں ہوگی، اگلی نسلیں اپنا قانون خود قرآن کی حدود میں وضع کرتی چلی جائیں گی۔ فقہ کوئی جامد Static چیز نہیں ہوتا۔ اگر سابقہ نسل کے قانون اور موجودہ دور کی نسل کے قانون میں کوئی فرق ہوگا، تو موجودہ نسل سابقہ قانون کو رد کر دے گی۔

ہر نسل اپنے دور کے موجودہ تقاضوں کے مطابق قانون بناتی چلی جائے گی۔ لیکن یہ شرط ہر وقت پیش نظر ہوگی کہ قانون قرآن کی حدود میں ہو، اس سے سرمو انحراف نہیں ہوسکتا۔

اِس مختصر سی تمہید کے بعد دیت کے مسئلہ پر غور کرتے ہیں۔ قرآن کریم میں دیت کا ذکر دو مقامات پر آتا ہے۔ ایک سورۃ بقرہ 178 اور دوسرا مقام سورۃ النساء 92 میں۔ سورہ بقرہ میں اصول ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قتل کا بدلہ قتل ہے۔ اس جگہ قتل کی تفصیل بیان نہیں فرمائی۔ لیکن سورہ النساء میں قتل کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور قتل عمد اور قتل خطا میں فرق بیان کیا گیا ہے اور ان کی سزاؤں میں بھی فرق بیان کیا، اگر قتل عمد اور قتل خطاء جرم کو نوعیت اور اس کی سزا میں فرق نہ ہوتا، تو قرآن اِس فرق کو کیوں بیان فرماتا۔ آپ پہلے دونوں آیات کریمات مع ترجمہ ملاحظہ فرمائیں۔ ہم فقہ کی اصطلاحات کو نظر انداز کر کے مسئلہ کو نہایت آسان کر کے تحریر کریں گے۔ البتہ آپ پہلے مسئلہ کو سمجھ لیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے قتل عمد کی سزا صرف قتل ہے، لیکن قتل خطا کی سزا میں دیت شامل ہے۔ ہمارے ہاں فقہ شریف میں قتل عمد کی سزا میں بھی دیت کو شامل کر دیا ہے۔ اور یہ قرآن کے خلاف ہے، ہم یہ بات ثابت کرنے کی کوشش کریں گے کہ فقہ شریف کا یہ فیصلہ کہ قتل عمد کی سزا بھی دیت ہے غلط ہے اور قرآن کے خلاف ہے اور قتل عمد کی سزا صرف قتل ہے، دیت ہرگز ہرگز اس میں شامل نہیں ہے۔ آپ اب دونوں آیات ایک جگہ ملاحظہ فرمائیں۔

(1) يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلٰى ۭ اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى ۭ فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَاۗءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ۭ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۭ (2:178)

ترجمہ: اے ایمان والو جو لوگ ناحق مارے جائیں ان کے بدلے میں تم کو جان کے بدلے جان لینے کا حکم ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے غلام، عورت کے بدلے عورت، پس جس قاتل کو اس کے بھائی کی طرف سے کچھ معاف کر دیا جائے تو اسے بھی اسی کے قدم بقدم نیکی کرنا اور خوش معاملگی سے خون بہا ادا کر دینا چاہئے۔ یہ تمہارے پروردگار کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔

(2) وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَـــًٔا ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَـــًٔا فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَّدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّصَّدَّقُوْا ۭ فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۭ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰٓى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۙ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝۹۲ (4:92)

ترجمہ: کسی مومن کو یہ جائز نہیں کہ کسی مومن کو جان سے مار ڈالے، مگر خطا سے جو شخص کسی مومن کو خطا سے

قتل کر ڈالے تو اس پر ایک ایماندار غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے قرابت داروں کو خون بہا دینا لازم ہے۔ مگر جب وہ لوگ معاف کر دیں تو پھر اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہے جو تمہارے دشمن ہیں اور خود قاتل مومن ہے تو صرف ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا اور اگر مقتول ان لوگوں میں سے ہو جن کا تم سے عہد و پیمان ہو چکا ہے تو قاتل پر وارثانِ مقتول کو خون بہا دینا اور ایک بندۂ مومن کا آزاد کرنا واجب ہے۔

آپ نے دونوں آیات مع تراجم ملاحظہ فرمائیں ان کو ذہن میں مستحضر رکھیں۔ پہلی آیت میں قصاص کے حکم پر اصرار ہے تاکہ سوسائٹی میں امن وامان قائم رہے یہ واضح رہے کہ قصاص کے معنے بدلہ لینا یا سزا دینا نہیں ہے بلکہ قصاص کے معنے مجرم کا تعاقب کرنا اور ان کو ہر حالت میں trace out کرنا ہے۔ قتل کے بدلے قتل کا حکم دیا گیا ہے اور یہ بات واضح کی گئی ہے کہ قتل کے بدلے میں رتبہ اور Status کا کوئی خیال نہ رکھا جائے۔

دوسری آیہ کریمہ میں قرآن نے قتل کی وضاحت کی ہے اور قتل عمد اور قتل خطا کا فرق واضح فرمایا ہے۔ چونکہ دونوں قتل کی نوعیت ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اِس لئے ان کی سزاؤں میں بھی فرق رکھا ہے۔ قتل بالخطا میں دیت کا حکم ہے۔ اِس دیت کے ادا کرنے کی تفصیل بھی بیان فرمائی ہے۔ ہمیں دیت کی ادائیگی کی تفصیل سے یہاں کوئی بحث نہیں۔ اس کا اصل issue سے تعلق نہیں۔ اصل issue تو یہ ہے کہ قتل عمد میں دیت کی اجازت بالکل نہیں ہے۔

قرآن کریم کا ہر طالب علم یہ جانتا ہے کہ قرآنِ کریم اپنا مفہوم تصریف آیات سے واضح کرتا ہے قرآن نے فرمایا کہ جو چیز چاہو کھاؤ پیو مگر اسراف نہ کرو (7:31)' لیکن تین مقامات پر 4 چیزوں' مردار لہو' سور کا گوشت' اور منسوب اِلیٰ غیر اللہ کو حرام قرار دے دیا۔ ان چار چیزوں کا کھانا حرام ہے (2:173، 16:115، 5:3) اسی طرح قرآن نے نکاح کا حکم دیا کہ جو عورتیں تمہیں پسند کریں تم ان سے نکاح کر لو (4:3) لیکن دوسرے مقام پر محرمات کی فہرست دے کر فرمایا کہ ان عورتوں سے نکاح جائز نہیں ہے (4:23)۔ قتل کی سزا کے بارے میں بھی قرآن نے دو جگہ ذکر کیا ہے۔ ایک مرتبہ سورۂ بقرہ میں مطلق قتل کا ذکر ہے وہاں قصاص پر اصرار اور قاتل کے مرتبہ کی تردید کی گئی ہے۔ سورہ النساء میں قتل کی نوعیت کو واضح کیا اور اس میں قتل بالخطاء میں دیت کے حکم کو شامل کیا۔

چونکہ ہماری زندگی پر رہبانیت کا اثر ہے اور ہم ہر طرح سے کوشش کرتے ہیں کہ اسلامی نظام کو درمیان میں نہ آنے دیں اس لئے ہمارے فقہ نے اس قتل کو فرد کے خلاف جرم قرار دیا ہے حالانکہ قتل عمد ریاست کے خلاف Crime ہے۔ مجرم کو تلاش کرنا ورثا کا کام نہیں ہے اور نہ ہی بدلہ لینا ورثا کا کام ہے۔ اگر وارث کمزور ہیں تو وہ تو بدلہ لے ہی نہیں سکتے۔ قرآن کریم میں جہاں یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ (2:183) کے الفاظ آتے ہیں' اس میں اصل تخاطب اسلامی نظام سے ہوتا ہے۔

سورۂ نساء کی آیت میں جب واضح طور پر ''وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَئًا'' (4:92) میں خطاء کا لفظ داخل کر دیا تو یہ اس بات کی محکم' اور ناقابل تردید دلیل ہے کہ دیت کا انحصار صرف اور صرف خطاء پر ہے۔ یہاں قرآن نے خطاء کے لفظ کو شامل

کر کے قتل عمد کو دیت سے خارج کر دیا ہے۔

یہ بات واضح رہے کہ قتل عمد اور قتل خطاء دونوں صورتوں میں اصل ذمہ داری سٹیٹ کی ہے۔ ورثا پر نہ کوئی ذمہ داری ہے نہ ان کا کوئی بنیادی کردار ہے۔ قتل خطاء میں بھی دیت کی رقم کا تعین اور اس کی لین دین حکومت کی معرفت ہوگی۔ ورثا کو از خود معاف کرنے کا اختیار نہیں ہے' کیونکہ ورثا متوفی کے ترکے کے وارث ہوتے ہیں' اس کی جان کے وارث نہیں ہوتے۔

یہ بات بھی پیش نظر رکھیں کہ اللہ کے نام پر معاف کرنے کا طریقہ بھی رہبانیت کا طریقہ ہے۔ اسلامی مملکت میں کسی شہری کا کوئی تعلق براہِ راست اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا۔ صرف نظام کی معرفت ہوتا ہے اور اسی کی معرفت اطاعت و معصیت ہوتی ہے۔ قرآن میں ارشاد ہے کہ اے ایمان والو اللہ کو قرضہ دو (73:20)' اس کے یہ معنے نہیں کہ لوگ روپوں کی بوریاں لے کر آسمان پر اللہ تعالیٰ کو رقم دے آئیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کے نظام کو قرض دو اور اس کو مضبوط کرو۔ اللہ کے نام پر معاف کرنے کا یہ تصور رہبانیت کا ہے۔ قرآن کی رو سے اللہ کے نام پر معاف کرنے کا مطلب یہ ہے کہ جسے معاف کرنا ہے اسے نظام کی معرفت معاف کیا جائے۔

آپ ملاحظہ فرما رہے ہیں کہ یہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن نے دیت کی سزا صرف قتل خطاء میں رکھی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے فقہ نے اتنی بڑی لغزش کی کہ اس میں قتل عمد کو بھی شامل کر لیا۔ اس کی وجہ آیہ کریمہ کا یہ حصہ ہے ''فَمَنْ عُفِيَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَيْءٌ'' (2:178) (ترجمہ) ''جسے اس کے بھائی نے کچھ معاف کر دیا ہو''۔ آیہ کریمہ کے اس حصہ کا تعلق قتل خطاء سے ہے۔ اس کا تعلق قتل عمد سے ہے ہی نہیں۔ ہمارے فقہ نے اس حصہ کا تعلق قتل عمد سے کر کے بڑی لغزش کی اور اسی وجہ سے یہ ساری پیچیدگی پیدا ہوئی۔ آپ خود غور فرمائیں کہ اس آیت کا تعلق اس جرم سے ہو ہی نہیں سکتا جس کی سزا موت ہو۔ کیونکہ موت کی سزا کا کوئی حصہ معاف کیا ہی نہیں جا سکتا۔ اِس آیت کا تعلق اس جرم پر ہوگا جس کی سزا کا کوئی حصہ معاف کیا جا سکتا ہو۔ یہ سزا' دیت' قتل خطاء کی ہے۔ کیونکہ قتل عمد کی سزا' موت میں سے کوئی شے معاف ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا سورہ بقرہ کی آیت کو سورہ النساء کی آیت کے ساتھ پڑھ کر مطلب واضح ہوتا ہے کہ

(1) قتل عمد کی سزا موت ہے جس میں سے کچھ معاف کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(2) کچھ معاف کرنے کا سوال اسی جرم کے ضمن میں ہو سکتا ہے جس کی سزا ایسی ہو جس میں سے کچھ معاف کیا جا سکے' اور وہ جرم قتل خطاء ہی ہو سکتا ہے' قتل عمد ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ قتل عمد میں بھی دیت کی اجازت ہے تو معاشرہ میں قتل کا دروازہ کھل جائے گا۔ امیر آدمی قتل کر کے دیت دے دیں گے اور غریب آدمی بالکل غیر محفوظ ہو جائے گا۔

یہاں دیت سے متعلق مضمون ختم ہو گیا۔

روزنامہ دی نیوز مورخہ 22 ستمبر 2013ء میں ایک مضمون جناب محترم افتخار مرشد صاحب کا طبع ہوا ہے۔ جس میں اُنہوں نے دیت کے موضوع پر تبصرہ کیا ہے۔ ہمارے ہاں اتفاق سے چونکہ صرف دیت کے متعلق واقعات پیش آ رہے ہیں

اس لئے یہ موضوع بار بار زیر بحث آ رہا ہے۔ لیکن آپ یقین کریں کہ ہمارا فقہ کا اکثر حصہ اسی طرح کے خلافِ قرآن قوانین پر مشتمل ہے۔ اب جو کوئی مسئلہ بھی پیش آئے گا یہ بات کھلتی چلی جائے گی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اول تو یہ ایک ہزار سال پیشتر کے بنائے ہوئے قوانین ہیں۔ اِس کے وضع کرنے کا طریقہ غلط ہے۔ یہ تو ہمارے علمائے کرام اور فقہائے عظام کی ذاتی' انفرادی آراء ہیں۔ ان کو حضرت امام ابوحنیفہؒ اور امام جعفر صادقؒ کی طرف منسوب کیا ہوا ہے۔ ان دونوں حضرات کی کوئی کتاب ہی موجود نہیں ہے۔ دیت کے بارے میں ہمارے دانشور' اینکرز' اور .T.V چینلز کے مباحثوں میں حصہ لینے والے حضرات' سب اِس قانون پر اعتراض کرتے ہیں کہ قتل عمد میں خوں بہا کس طرح درست ہوسکتا ہے۔ لیکن جب ان کے سامنے شرعِ شریف کا حوالہ دے دیا جاتا ہے۔ تو وہ خاموش ہوجاتے ہیں۔ ان حضرات میں سے کوئی شخص یہ تکلیف گوارا نہیں کرتا کہ وہ خود براہِ راست اِس قانون پر غور کرے۔

محترم جناب افتخار مرشد صاحب نے اپنے قیمتی اور علمی مضمون میں' جناب سابق چیف جسٹس افتخار محمد چودہری صاحب کی رائے دیت کے بارے میں نقل کی ہے۔ ہم محترم چیف جسٹس صاحب کی رائے ان کے الفاظ میں لکھ رہے ہیں۔ آپ خود ملاحظہ فرمالیں۔

"Pardoning a murder "in the name of God was a travesty and amounted to circumvention of the Law"

محترم جناب چیف جسٹس کے الفاظ تو چند ہی ہیں لیکن ان کا مفہوم بہت وسیع وعمیق ہے۔ اِس سے زیادہ بھرپور تبصرہ اور نہیں ہوسکتا ہے۔ ہم موجودہ جناب چیف جسٹس صاحب کی خدمتِ عالیہ میں اتنا عرض کرسکتے ہیں کہ وہ ہمارے فقہ کو قرآن کے مطابق بنانے کی راہ ڈال دیں تاکہ ہمارا فقہ قرآن کے مطابق ہوجائے۔ اور اسلامی قانون اضحوکہ بننے سے بچ جائے یہ آپ کی بہت بڑی خدمت ہوگی۔ یہ کام ایک دو دن کا نہیں ہے۔ اس میں بڑی محنت درکار ہے۔ اِس کی شدید ترین مخالفت ہوگی۔ اس میں Spade work تحریک طلوع اسلام بڑی حد تک کرچکی ہے۔ اِس سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ اب بھی تحریک طلوع اسلام مزید مدد دے سکتی ہے ضرورت صرف خلوص اور جرأت کی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے' صوفی غلام مصطفیٰ تبسم کو ایک خط میں تحریر فرمایا تھا کہ جو شخص اِس دور میں اسلامی فقہ کو قرآن کے مطابق بنائے گا۔ اس کا درجہ اس دور کے امام ابوحنیفہ کے برابر ہوگا۔ ہماری دُعا ہے کہ یہ سعادت آپ کے حصہ میں آجائے۔ اللہ تعالیٰ خود آپ کی مدد فرمائے گا۔ کیونکہ اس کا وعدہ ہے کہ اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْکُمْ (47:7) اگر تم اللہ کی مدد کروگے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا' اللہ کی مدد یہی ہے کہ اس کے قانون کو صحیح طور پر معاشرہ میں جاری کیا جائے۔ ہماری ہر طرح کی مدد آپ کے لئے حاضر ہے۔

(مطبوعہ، طلوع اسلام، نومبر 2013ء)

☆.....☆.....☆

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

میں تجھ کو بتاتا ہوں، تقدیرِ اُمم کیا ہے (قسط نمبر 2)

# قومیں کیوں تباہ ہوتی ہیں؟

## (خدائی فیصلے)

### قومِ مدیَنؔ:

حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹے کا نام مدیَنؔ تھا۔ اس کی نسل تاریخ کے صفحات پر قومِ مدین کے نام سے متعارف ہوئی۔ یہ قومِ حجاز کے شمال میں، شام سے متصل علاقے میں سکونت پذیر تھی۔ حضرت شعیب علیہ السلام اس قوم کی طرف مبعوث ہوئے تھے جن کا زمانہ قریب 1200 (ق،م) قیاس کیا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی تصریحات کے مطابق، یہ قوم تجارت پیشہ تھی۔ اور اس شعبہ میں انہوں نے بڑی ترقی حاصل کر رکھی تھی لیکن ہر سرمایہ پرست تجارت پیشہ قوم کی طرح ان کا انداز بھی یہ تھا کہ وہ ''لیتے زیادہ تھے اور دیتے کم تھے۔''

### سرمایہ پرستوں کا نظامِ تجارت:

ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی تھی کہ ایک طرف محنت کش کے خون کا آخری قطرہ تک بھی نچوڑ لیں اور دوسری طرف ہر حیلہ کاری اور فریب دہی سے گاہک کی جیب بھی کاٹ لی جائے۔ قومِ ثمود میں اگر نظامِ سرمایہ داری کا عفریت زمینداری کی شکل میں لکدکوب تھا، تو قومِ مدیَنؔ میں، وہ سوداگری کے پیراہن میں پائے زن۔ یہ تھی وہ قوم جس کی طرف، آسمانی انقلاب کے پیامبر، حضرت شعیب علیہ السلام مبعوث ہوئے۔ قرآنِ کریم نے ان کے تذکارِ جلیلہ کا آغاز ایک عمیق، بصیرت افروز نکتہ سے کیا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو ان کی قوم نے سمجھا کہ یہ خدا پرست انسان، لوگوں کو ایشور کی بھگتی اور پوجا پاٹ کی تلقین کرتا ہے، سو یہ بات قابلِ اعتراض نہیں۔ اس لئے اسے اس کی اجازت دے دینی چاہئے۔ لیکن اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ یہ شخص ان کے کاروباری معاملات میں بھی دخل اندازی کرنے لگ گیا ہے۔ کبھی ان سے کہتا ہے کہ: وَلَا تَنۡقُصُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ (11:84) دیکھو! اپنے ماپ اور عرتول کے پیمانے کم نہ رکھو۔ اَوۡفُوا الۡمِکۡیَالَ وَالۡمِیۡزَانَ بِالۡقِسۡطِ (11:84) ٹھیک ٹھیک ماپو۔ صحیح صحیح تولو۔ وَلَا تَبۡخَسُوا النَّاسَ اَشۡیَآءَہُمۡ (11:85) گاہک کو

اس کی ادا کردہ قیمت کے مطابق چیز دو۔ نہ اس میں کمی کرو نہ ملاوٹ۔ اور کبھی ان سے کہتا ہے کہ: وَلَا تَقْعُدُوْا بِكُلِّ صِرَاطٍ تُوْعِدُوْنَ (7:86)۔ ایسا نہ کرو کہ مختلف شاہراہوں پر راہزن بن کر بیٹھ جاؤ۔ بارڈروں پر جا کر سمگلنگ کرو۔ وَتَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِهٖ وَتَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ (7:86) اور جو دیانتدار انسان تمہیں اس روش سے روکے، اسے ڈرانے دھمکانے لگ جاؤ۔ اور اس طرح معاشرے میں ناہمواریاں اور پیچیدگیاں پیدا کرتے چلے جاؤ۔

## یہ صلوٰۃ کیسی ہے؟

اس پر وہ لوگ بڑے متعجب ہوئے اور حضرت شعیب علیہ السلام سے کہنے لگے کہ تم نے ہم سے صلوٰۃ کی اجازت مانگی تھی اور ہم نے اس کی یہ سمجھ کر اجازت دے دی تھی کہ تم اگر اپنے طریق پر خدا کی پرستش کر لیا کرو تو اس پر ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے لیکن قَالُوْا يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ۭ (11:87) تمہاری یہ صلوٰۃ کس قسم کی ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق صرف میں لا سکیں۔ نماز کو معاشی نظام سے کیا واسطہ! نماز کا تعلق مذہب سے ہے، معاشیات کا تعلق امورِ دنیا سے۔۔۔ یہ تمہارا مذہب کس قسم کا ہے جس کا دائرہ معاشیات تک کو بھی محیط ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ سیکولر نظامِ زندگی کا تصور کچھ عصرِ حاضر کی ایجاد نہیں۔ دین اور مذہب کا یہ فرق شروع سے چلا آ رہا ہے۔ اربابِ سیاست و معاشیات کو اس سے کچھ تعرض نہیں ہوتا کہ لوگ مذہبی عقاید کس قسم کے رکھتے ہیں۔ اور پرستش اور پوجا پاٹ کس طور طریق سے کرتے ہیں۔ یہ مذہب کی دنیا ہے جس کی وہ پوری پوری آزادی دے دیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی اجازت نہیں دے سکتے کہ مذہب، دنیاوی معاملات میں بھی دخل اندازی کرے۔ (اسے دین کہتے ہیں) قومِ شعیب علیہ السلام کا تصورِ زندگی بھی سیکولر انداز کا تھا۔ اسی لئے وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی اُس دعوت پر متعجب اور معترض تھے جس کی بنیاد دین پر تھی۔

اس مقام پر ایک اور حقیقت بھی سامنے آتی ہے۔ حضرات انبیاء کرامؑ عام طور پر ممتاز گھرانوں کے افراد ہوتے تھے۔ اس لئے جب وہ اس روش کی مخالفت کرتے تھے جو خود ان کے اپنے گھرانے اور اسی جیسے دوسرے گھرانوں میں متوارث چلی آتی تھی، تو غیر تو ایک طرف، خود اپنوں کو بھی ان پر تعجب ہوتا تھا کہ یہ عجیب پاگل ہے جو اپنے گھر کی دولت و حشمت اور شرف و عزت کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ رہا ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام بھی ایک ذی اثر گھرانے کے فرد تھے۔ اسی لئے قوم کے اکابرین نے ان سے کہا کہ: وَلَوْلَا رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۡ (11:91) اگر ہمیں تمہارے خاندان اور برادری کا پاس نہ ہوتا تو ہم تمہیں کبھی کا سنگسار کر چکے ہوتے۔ اس کے جواب میں حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ: اَرَهْطِيْٓ اَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۭ (11:92) تم عجیب لوگ ہو جنہیں خدا کے قانونِ مکافات کا تو کچھ ڈر نہیں لیکن میری برادری کا پاس اس سے بھی زیادہ ہے۔

اِدھر سے ہٹ کر، انہوں نے اُن لوگوں کو ڈرانا دھمکانا شروع کیا جنہوں نے حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہا

تھا۔ یہ غریب لوگ تھے اور ان کی برادریاں بھی طاقتور اور ذی اثر نہیں تھیں۔ ان اَلْمَلَأُ اَلْقَوْمِ نے ان سے کہا کہ تم اس انقلابی شخص کا ساتھ چھوڑ دو، ورنہ نقصان اٹھاؤ گے (7:90) لیکن انہوں نے بھی ان کی ایک نہ مانی۔

بہرحال، انہوں نے اپنے نظام کو نہ بدلا، تآنکہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اس طرح ان کے اوپر آ کر گرا کہ وہ اس کے بوجھ تلے دب کر رہ گئے اور ان کے گھر اس طرح اُجڑ کر رہ گئے كَأَن لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۚ (11:95) گویا وہ ان میں کبھی بسے ہی نہ تھے۔

یہ تھا انجام اس نظامِ معیشت کا جس میں تجارت، خون آشامی کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ تجارت کا تعلق شہری معیشت سے ہوتا ہے۔ جہاں تک ان کی دیہاتی زندگی کا تعلق ہے، وہاں وہی زمینداری نظام رائج تھا جسے ہم قومِ ثمود کے ہاں دیکھ آئے ہیں۔ اس کی ایک جھلک ہمارے سامنے قصۂ صاحبِ ضربِ کلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام میں آتی ہے۔

## مدین کا پیاؤ:

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام (زمانہ قبل از نبوت میں) فرعون کے پنجہ استبداد سے بچنے کی خاطر، مصر سے بھاگے ہیں تو مدین کے علاقہ میں، سرِ راہے ایک پیاؤ کے قریب آ کر، درختوں کے سایہ میں ستانے کے لئے بیٹھ گئے۔ وہ دیکھتے کیا ہیں کہ سامنے پیاؤ پر، اوروں کے مویشی پانی پی پی کر چلے جا رہے ہیں لیکن دو لڑکیاں ہیں جن کی بھیڑیں پیاس کی شدت سے پیاؤ کی طرف دوڑ دوڑ کر جانا چاہتی ہیں لیکن وہ لڑکیاں انہیں آگے بڑھنے سے روک رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے نہ رہا گیا اور ان لڑکیوں سے پوچھا کہ یہ کیا ماجرا ہے۔ تم اپنی پیاسی بھیڑوں کو اس طرح روک کیوں رہی ہو؟ انہوں نے کہا کہ ان مویشیوں کے چرواہے زور آور ہیں اور ہماری حالت یہ کہ گھر میں کوئی مرد نہیں بجز ایک باپ کے، جو بوڑھا ہو چکا ہے۔ اس لئے جب تک یہ چرواہے اپنے مویشیوں کو پانی پلا کر، چلے نہیں جاتے، ہم اپنی بھیڑوں کو کیسے آگے بڑھنے دے سکتی ہیں۔ یہ سن کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک سرد آہ بھری اور کہا کہ ؎

بہر زمینے کہ رفتیم آسماں پیداست

ارضِ فرعون سے بھاگا تھا کہ وہاں کمزوروں اور غریبوں پر طرح طرح کے مظالم ہوتے ہیں۔ یہاں آیا ہوں تو یہاں بھی کمزوروں اور بے کسوں کی وہی حالت ہے۔ یہ کہہ کر اُٹھے۔ آگے بڑھ کر ان کی بھیڑوں کو پانی پلایا اور پھر درختوں کے نیچے آ کر بیٹھ گئے اور بحضور ربّ العزت عرض کی کہ:

اب تو ہی بتا تیرا مسلمان کدھر جائے!

یہ تھی قومِ مدین کی دیہاتی زندگی، اور وہ تھی اُن کی شہری زندگی۔ ظاہر ہے کہ وہ تباہ نہ ہوتی تو اور کیا ہوتا؟

****

## قومِ لُوط:

اس وقت تک جن اقوام کی سرگذشت ہمارے سامنے آئی ہے وہ اپنے غلط سیاسی یا معاشی نظام کی وجہ سے تباہ ہوئیں۔ اب ہمارے سامنے ایک ایسی قوم آتی ہے جس کا جرم، خود ان کے نام کے اندر مضمر ہے۔ یہ ہے قومِ لوطؑ، جس کی نسبت سے لوطت کی نہایت مکروہ اصطلاح وجود میں آئی۔ ان کے مرکزی مقام کا نام سدومؔ تھا جسے انگریزی میں (SODOM) لکھتے ہیں۔ (SODOMY) کے لفظ کی نسبت اسی کی طرف ہے۔

قرآنِ کریم عصمت کو بڑی اہمیت دیتا ہے اور اس کا شمار مستقل اقدار میں کرتا ہے۔ ایسا ہونا بھی چاہئے تھا کیونکہ عصمت خاصۂ انسانیت ہے۔ حیوانوں میں اس کا تصور نہیں ہوتا۔ لہٰذا جسے عصمت کا احساس نہ رہے وہ انسانی سطح سے گر کر حیوانی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔ اور جب جنسی جذبہ کی تسکین بدنہادی (Perversion) تک پہنچ جائے تو وہ مقام بَلْ هُمْ اَضَل کا ہوتا ہے۔ یعنی حیوانوں سے بھی زیادہ پست سطح۔ کیونکہ حیوانوں میں (Sex - Perversion) نہیں ہوتی۔ یہ جرم انفرادی طور پر بھی کچھ کم شرم ناک نہیں ہوتا لیکن جب یہ کسی معاشرہ کا عام معمول بن جائے تو اسے انسانی معاشرہ کہا ہی نہیں جا سکتا۔ آج سے کچھ عرصہ پہلے تک جب قومِ لوط کی سرگذشت ہمارے سامنے آتی تھی تو ہم حیران رہ جاتے تھے کہ وہ قوم پوری کی پوری اس قسم کی شنیع حرکت کی مرتکب کیسے ہوگئی لیکن اب یہ بات چنداں وجۂ حیرت نہیں رہی۔ قومِ لوطؑ کی سرگذشت تو آج سے چار ہزار سال پہلے کے دورِ جہالت سے متعلق ہے۔

## دورِ حاضرہ کی حالت:

آج اس بیسویں صدی کے زمانۂ علم وبصیرت میں دنیا کی سب سے بڑی مہذب اور متمدن قوم، برطانیہ نے حال ہی میں وہ قانون پاس کیا ہے جس کی رو سے لواطت (HOMO - SEXUALITY) کو جرائم کی فہرست سے خارج کر دیا گیا ہے[1] سچ کہا تھا قرآن نے کہ: لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ۝ (95:4-5) ہم نے تو انسان کو حسین ترین ہیئت میں پیدا کیا تھا۔ لیکن، یہ کمبخت، اپنی حرکات سے اپنے آپ کو پست سے پست سطح پر لے جاتا ہے۔

اُس قوم کی بے حیائی اور سرکشی کا یہ عالم تھا کہ جب حضرت لوطؑ نے انہیں اس انسانیت سوز فعل سے باز رہنے کی تلقین کی تو بجائے اس کے کہ انہیں اس پر کچھ ندامت ہوتی، وہ آپس میں کہنے لگے کہ اَخْرِجُوْٓا اٰلَ لُوْطٍ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ (27:56)۔ ''یہ لوگ اپنے آپ کو بڑا مقدس اور پاک باز سمجھتے ہیں۔ انہیں بستی سے نکال باہر کرو۔'' اس پوری قوم کی طرف سے اس قسم کی باتیں سن کر حضرت لوطؑ محوِ حیرت رہ جاتے تھے اور انتہائی تعجب اور تاسف سے کہتے تھے

(1) اب امریکہ سے اس قسم کی اطلاعات موصول ہو رہی ہیں۔

کہ اَلَیۡسَ مِنۡکُمۡ رَجُلٌ رَّشِیۡدٌ (11:78) کیا تم میں کوئی ایک آدمی بھی ایسا نہیں جو ذرا سوجھ بوجھ سے کام لے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ یہ وبا اس قدر عام ہو چکی تھی کہ اس کے ہلاکت آفرین جراثیم سے قوم کا کوئی متنفس بھی محفوظ نہیں رہا تھا اور ظاہر ہے کہ جب کسی قوم میں جرائم اس درجہ عام ہو جائیں تو اس کی تباہی میں کون سی کسر باقی رہ سکتی ہے۔ چنانچہ بحر میت (Dead Sea -) کا مہیب اور لرزہ فگن ماحول اور اس میں بکھرے ہوئے کھنڈرات کی ویرانیاں، آج بھی اس سوختہ بخت قوم کے عبرت انگیز انجام کے مرثیہ خواں ہیں۔

اقوامِ مغرب کی عریاں اور آبرو باختہ تہذیب سے متاثر ذہنیتوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ جنسی جذبہ کی تسکین کا، قوموں کی موت وحیات سے کیا واسطہ! ان لوگوں کو وحی کی سند سے کچھ سمجھانا بے کار ہے۔ وہ اسے سند مانتے ہی نہیں۔ لیکن مغربی محققین کو تو یہ سند تسلیم کرتے ہیں۔ ہم ان سے کہیں گے کہ وہ ان محققین سے پوچھ لیں کہ ان کی تحقیق اس باب میں کیا کہتی ہے۔ زیادہ نہیں تو وہ کیمبرج یونیورسٹی کے ریسرچ سکالر ڈاکٹر (J.D.Unwin) کی کتاب (Sex & Culture) اٹھا کر دیکھ لیں جسے انہوں نے اسی غیر مہذب قدیم قبائل، اور سولہ مہذب اقوام کی جنسی زندگی کے مطالعہ کے بعد مرتب کیا ہے۔ وہ اپنی تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ:

> اگر کسی قوم کی تاریخ میں آپ دیکھیں کہ کسی وقت اس کی تمدنی سطح بلند ہو گئی تھی یا نیچے گر گئی تھی تو تحقیق سے معلوم ہوگا کہ اس قوم نے اپنے جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کی تھی جس کا نتیجہ اس کی تمدنی سطح کی بلندی یا پستی تھا۔ (ص:203)

اور اس کے بعد اُس نے کہا ہے کہ:

> جنسی تعلقات کے ضوابط میں تبدیلی کے اثرات تین پشتوں کے بعد (یعنی قریب سو سال میں) نمودار ہوتے ہیں۔ (ص:331)

لہٰذا جنسی ضوابط سے بیباک ہو جانے والا معاشرہ سمجھتا ہے کہ اس سے اس کا کچھ نہیں بگڑتا تو اسے اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں رہنا چاہئے۔ اس کا آخری نتیجہ قومی تباہی کے سوا کچھ اور ہو نہیں سکتا۔[1]

.....***.....

## قومِ فرعون:

اس کے بعد ہمارے سامنے وہ قوم آتی ہے جس کے جرائم کی فہرست طول طویل ہے لیکن قرآنِ کریم نے انہیں تین اصولی اور اساسی شقوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ یعنی استبداد ملوکیت کی قہرسامانیاں جن کا مجسمہ فرعون تھا۔ مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ

(1) اس کی تفصیل ''سلیم کے نام خطوط'' کی تیسری جلد میں ملے گی۔

کاریاں جن کا پیکر ہامان تھا اور نظامِ سرمایہ داری کی خون آشامیاں جن کا نمائندہ قارون تھا۔ یہ تینوں یکجا اور ان کے آہنی پنجے میں گرفتار قوم بنی اسرائیل کی شکل میں، تڑپتی، پھڑکتی انسانیت۔ دوسری طرف، قرآنِ کریم نے ان تینوں گوشوں کے جرائم کا تذکرہ اس شرح وبسط سے کیا ہے کہ میری تصنیف، برقِ طور، کے قریب اڑھائی سو صفحات بمشکل انہیں اپنے دامن میں سمیٹ سکے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر تفصیل کو اس قدر مختصر وسعت میں سمیٹنا ناممکن ہے اس لئے ان کے سرسری تذکرہ پر اکتفا کیا جائے گا۔

## پارٹی بازی:

جیسا کہ نظامِ ملوکیت کا خاصا ہے، فرعون نے قومِ بنی اسرائیل کو اپنا محکوم بنا رکھا تھا اور انہیں طرح طرح کے عذاب دیتا تھا۔ وہ اس ڈر سے کہ بنی اسرائیل کہیں ایک مرکز پر جمع ہو کر اس کے لئے خطرہ کا موجب نہ بن جائیں، کرتا یہ تھا کہ: وَجَعَلَ اَهْلَهَا شِيَعًا يَّسْتَضْعِفُ طَآئِفَةً مِّنْهُمْ (28:4) ان میں پارٹیاں بناتا رہتا اور اس طرح انہیں آپس میں لڑا کر ان کی قوت کو کمزور کرتا رہتا۔ پھر اس کی چال یہ تھی کہ: يُذَبِّحُ اَبْنَآءَهُمْ وَيَسْتَحْيٖ نِسَآءَهُمْ ط (28:4) وہ اس قومِ محکوم کے جن افراد میں جوہرِ مردانگی کے آثار دیکھتا، انہیں کچل دیتا اور ان کے نامرد طبقے کو اپنا مقرب بناتا اور آگے بڑھاتا رہتا۔ اس نے رزق کے سب سرچشمے اپنے قبضے میں کر رکھے تھے اس لئے یہ مظلوم ومحکوم قوم، نانِ شبینہ تک کے لئے اس کی محتاج تھی۔ اسی لئے اس نے جب ان میں ذرا سی سرکشی کے آثار دیکھے تو گرج کر کہا کہ: اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ ۚ (43:51)۔ تم جانتے نہیں کہ یہ ملک میرا ہے۔ اس میں بہنے والی نہریں میرے قبضے میں ہیں۔ میں تمہیں بھوکا مار دوں گا۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى ۝ (79:24)۔ میں تمہارا پالن ہار ہوں اس لیے مجھے حق حاصل ہے کہ تم پر حکومت کروں۔ جو تمہیں روٹی دیتا ہے وہی ان کا آقا اور خدا ہوتا ہے۔

## اَن داتا:

آپ دیکھتے ہیں کہ اس ذہنیت سے کس طرح تمرّد ونخوت کے شعلے اُبھرتے اور سرکشی اور انانیت کے طوفان اٹھتے ہیں۔ یہ تھا وہ فرعون جس کی طرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ کہہ کر بھیجا گیا کہ: اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰى ۝ (79:17) فرعون کی طرف جاؤ۔ اس نے ظلم وستم کی انتہا کر دی ہے۔ اس کی سرکشی حدود فراموش ہو گئی ہے۔ دوسرے مقام پر ہے۔ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا عَالِيْنَ ۝ (23:46)۔ ''جاؤ فرعون اور اس کے اراکین مملکت اور سردارانِ قوم کی طرف جو تکبر ونخوت کے پیکر ہیں۔'' قرآنِ کریم نے اس قوم کو کہیں مجرمین کہا ہے کہیں ظالمین، کہیں مفسدین کہا ہے کہیں فاسقین۔ یعنی ظلم واستبداد اور سرکشی وحدود فراموشی کے جس قدر جرائم ہو سکتے تھے وہ سب ان میں موجود تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف آئے اور اس سے کہا کہ میں خدائے رب العالمین کا پیغامبر ہوں اور تم سے صرف اتنا

مطالبہ کرنے کے لئے آیا ہوں کہ: اَرْسِلْ مَعَنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ ﴿۱۷﴾ (26:17) بنی اسرائیل کو میرے ساتھ بھیج دو۔ دوسرے مقام پر جو الفاظ آئے ہیں وہ اس پیغمبرانہ مشن کی اور بھی زیادہ وضاحت کرتے ہیں۔ آپ نے اس سے کہا کہ میں اس لئے آیا ہوں۔ اَنْ اَدُّوْٓا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰہِ ط (44:18) خدا کے بندوں کو میرے حوالے کر دے کہ میں انہیں خدا کی زمین میں لے جاؤں، جہاں وہ خدا کے سوا کسی کے محکوم نہ ہوں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہاں عباد اللہ کہہ کر ساری بات واضح کر دی۔ یعنی کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو اپنے فیصلوں کا محکوم بنائے۔ انسان صرف قوانینِ خداوندی کی اطاعت کرنے کے لئے پیدا کیا گیا ہے، اپنے جیسے انسانوں کا غلام بننے کے لئے نہیں۔

آپ نے دیکھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مطالبہ کس قدر صاف، سیدھا اور مبنی برحق و انصاف تھا۔ انہوں نے نہ فرعون سے اس کی بادشاہت چھین لینے کا مطالبہ کیا تھا، نہ اس کی حکومت میں شریک ہونے کا دعویٰ۔ کہا صرف یہ تھا کہ اس مظلوم قوم کو اجازت دے دو کہ یہ کسی اور خطۂ زمین کی طرف چلی جائے۔ لیکن ظاہر ہے کہ اگر ایک قوم غالب اپنے ہاں کی اقلیت کو وہاں سے چلے جانے کی اجازت دے دے تو وہ پھر حکومت کس پر کرے؟ (ضمناً، یہ بعینہٖ وہی پوزیشن تھی جو تقسیم ہند سے پہلے ہمارے اور ہندوؤں میں بنائے نزاع تھی۔ ہندو بھی اسی لئے ہماری علیحدگی پر راضی نہیں ہوتا تھا کہ اگر مسلمان وہاں سے چلے گئے تو وہ حکومت کس پر کرے گا۔)

## احسانات کی یاددہانی:

فرعون نے اس مطالبہ کی مخالفت کی لیکن معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی پوزیشن وہاں بڑی مؤثر اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقام خاصا بلند تھا۔ اسی لئے فرعون ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کر سکا اور اس کی بجائے اس نے سیاستِ ملوکانہ سے کام نکالنا چاہا۔ اس نے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اپنے دیرینہ روابط کا تذکرہ کیا اور کہا کہ ہم نے تم پر اس قدر احسانات کئے اور تم اس کا بدلہ اس طرح دے رہے ہو! آپ کو معلوم ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کا کیا جواب دیا۔ آپ نے کہا: وَتِلْكَ نِعْمَةٌ تَمُنُّهَا عَلَيَّ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۲۲﴾ (26:22)، تم نے مجھ پر جو ذاتی احسانات کئے، ان کی یاد تو دلاتے ہو، لیکن اپنے اس سب سے بڑے ''احسان کی یاد کیوں نہیں دلاتے کہ تم نے پوری کی پوری قوم بنی اسرائیل کو غلام بنا رکھا ہے! تم مجھ سے سودا کرنا چاہتے ہو کہ مجھ پر ذاتی نوازشات کی قیمت میں بنی اسرائیل کی آزادی خرید لو۔

بَرِدْ ایں دام را پیشِ دگر نہِ  کہ عنقا را بلند است آشیانہ

جب وہ اپنے اس حربے میں ناکام رہا تو اس نے پھر وہ تدبیر اختیار کی جو حکمتِ فرعونی کا آخری حربہ ہوتی ہے۔ یعنی اس نے جھوٹے پراپیگنڈہ سے عوام کو برانگیختہ کرنا چاہا کہ وہ بنی اسرائیل کے خلاف ہنگامہ آرائیاں شروع کر دیں۔ قرآنِ کریم میں ہے۔ قَالَ لِلْمَلَاِ حَوْلَهٗٓ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿۳۴﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ مِّنْ اَرْضِكُمْ بِسِحْرِهٖ ۖ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿۳۵﴾

(26:34-35) فرعون نے اپنے اراکینِ مملکت سے کہا کہ یہ شخص بہت بڑا فریب کار نظر آتا ہے۔ مطالبہ تو بظاہر یہ کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کو یہاں سے لے جائے لیکن درحقیقت اس کا پلان یہ ہے کہ تمہیں اس مملکت سے نکال باہر کرے اور خود حکمران بن بیٹھے۔ کہو! اس فتنے کو فرو کرنے کے سلسلہ میں تمہارا کیا مشورہ ہے؟

## مذہبی پیشوائیت:

اراکینِ مملکت نے کہا کہ اس کے خلاف اس قسم کا پراپیگنڈہ کارگر نہیں ہوگا۔ بہتر یہ ہے کہ اسے جذباتی مسئلہ بنا دیا جائے اور اسے مذہبی پیشوائیت کے ساتھ بھڑا کر عوام کو اشتعال دلایا جائے کہ یہ شخص اپنا مذہب تم پر مسلط کرنا چاہتا ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقابلۂ فرعون اور اس کے اراکین کے بجائے، ہامان اور اس کے جنود (مذہبی لشکروں) کے ساتھ شروع ہوتا ہے، جو (قرآن کے استعارے کے مطابق) رسیوں کے سانپ بنا بنا کر عوام کو فریب دیتے تھے۔ ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت کا گٹھ جوڑ کیسا ہوتا ہے، اور ان خدائی فوجداروں کے پیش نظر مقاصد کیا ہوتے ہیں، اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ وہ آتے تو ہیں اپنے مذہب کی حقانیت اور فوقیت ثابت کرنے کے لئے، لیکن بادشاہ سے پہلے معاملہ طے کرتے ہیں کہ ہم اگر کامیاب ہو گئے تو ہمیں ملے گا کیا؟ اور بادشاہ انہیں یہ لالچ دیتا ہے کہ ان کا شمار بادشاہ کے مقربین میں ہو جائے گا۔ دوسری طرف ان لوگوں کی منافقت کا یہ عالم تھا کہ قرآنِ کریم کے بیان کے مطابق، وہ دل سے اس حقیقت کو اچھی طرح جانتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعویٰ حق وصداقت پر مبنی ہے لیکن ان کا پندارِ نفس انہیں اس حقیقت کے اعتراف کی طرف آنے نہیں دیتا تھا۔ (27:14)

لیکن ان میں کچھ اللہ کے بندے ایسے بھی تھے جنہوں نے اس اعتراف کی جرأت کر لی اور اعلان کر دیا کہ موسیٰ علیہ السلام کا دعویٰ سچا ہے اس پر جس طرح فرعون گرجا اور برسا ہے، قرآنِ کریم نے مختلف مقامات پر اس کا ذکر کیا ہے۔ لیکن (بغرض اختصار) اس سلسلہ میں صرف ایک نکتہ کو سامنے لایا جاتا ہے اور وہ یہ کہ فرعون نے ان سے کہا کہ: اٰمَنْتُمْ لَهٗ قَبْلَ اَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ؕ (20:71) تم نے میری اجازت کے بغیر ہی اپنے عقیدہ میں تبدیلی کر لی اب دیکھو میں تمہارے کس طرح ٹکڑے ٹکڑے کر کے تمہیں صلیب پر لٹکاتا ہوں۔ اس سے ظاہر ہے کہ استبداد ملوکیت، آزادیٔ خیال وعقائد کی اجازت نہیں دیتا۔ اس میں تبدیلی عقیدہ (ارتداد) کی سزا موت ہوتی ہے۔

## قارون:

یہ تھا ملوکیت کے استبداد اور مذہبی پیشوائیت کی دسیسہ کاریوں کا گٹھ جوڑ۔ باقی رہا قارون، سو اس کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ وہ خود قومِ موسیٰ علیہ السلام میں سے تھا۔ یعنی بنی اسرائیل ایک طرف تو غیر قوم (قومِ فرعون) کے پنجۂ استبداد میں جکڑی ہوئی تھی اور دوسری طرف، خود اپنے ہاں کا سرمایہ دار طبقہ ان کا خون چوس رہا تھا۔

ظاہر ہے کہ جس نظام میں دسیسہ کاریٔ ملوکیت، ابلہ فریبیٔ مذہبی پیشوائیت اور خون آشامیٔ سرمایہ پرستی اس حد تک پہنچی ہو، وہ نظام اس قوم کو لے کر ڈوبے گا نہیں تو اور کیا ہوگا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور نُرِیَ فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَجُنُوْدَهُمَا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَحْذَرُوْنَ (28:6) فرعون اور ہامان اور ان کے لشکروں نے اپنی آنکھوں سے اپنا وہ انجام دیکھ لیا جس سے وہ اس قدر خائف تھے اور بنی اسرائیل نے آزادی کی فضا میں اپنی حکومت قائم کر لی۔

.....***.....

## قومِ بنی اسرائیل:

اور اب ہم اس قوم کی طرف آتے ہیں جسے فرعون کے مظالم سے رستگاری کے بعد، آزادی کی نعمت سے نوازا گیا تھا قرآنِ کریم نے اس قوم کی داستان بڑی شرح وبسط سے بیان کی ہے اور ان کے تمام جرائم کو ایک ایک کر کے گنایا ہے جن کے نتیجہ میں وہ شوکت وحشمت کی اس قدر بلندیوں تک پہنچنے کے بعد، اس طرح ذلیل وخوار ہوئی کہ دنیا کی کسی قوم میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ قرآن نے سب سے پہلے یہ کہا ہے کہ چونکہ اس قوم کو یہ مملکت، محض ان کے قائد (حضرت موسیٰ علیہ السلام) کے دعویٰ کی صداقت اور بلندی سیرت وکردار کی بنا پر، بیٹھے بٹھائے مل گئی تھی، اس لئے اسے اس کی قدر ہی نہیں تھی۔ وہ (تورات کے الفاظ میں) قدم قدم پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے جھلا جھلا کر کہتے تھے کہ: ''تو ہمیں کہاں مرنے کے لئے لے آیا ہے۔ ہم مصر میں بہت اچھے تھے۔ مصریوں کی ہانڈیاں پکاتے تھے اور من بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ ہم سے ہاتھ اٹھا کہ ہم پھر وہیں چلے جائیں کہ ہمارے لئے مصریوں کی خدمت کرنا، بیابان میں مرنے سے ہزار درجے بہتر ہوگا۔''

## بنی اسرائیل اور ہم:

عدم گنجائش مانع ہے ورنہ تفصیل سے بتایا جاتا کہ بنی اسرائیل کی غلامی، غلامی کے بعد آزادی اور (اس طرح مفت میں ملی ہوئی آزادی) کے بعد، ان کی ذہنی اور نفسیاتی کیفیت، اور اس کے عبرت آموز مظاہرے، کس طرح ہماری آزادی اور آزادی کے بعد ہماری حالت کے ہو بہو عکس ہیں۔ اُس داستان کو پڑھئے تو یوں نظر آتا ہے کہ مکان وزمان کی تبدیلی کے ساتھ وہ گویا خود ہماری کہانی ہے۔

بہرحال، جب حضرت موسیٰ علیہ السلام، ان کی اس قسم کی حرکتوں سے تنگ آ کر خدا سے فریاد کرتے کہ اس قسم کی قوم کا کیا کروں، تو انہیں جواب ملتا کہ یہ قوم غلامی کی فضا میں پرورش یافتہ ہے، اس لئے ان کی ذہنیت بدلتے بدلتے ہی بدلے گی۔ تم ان کے بڑے بوڑھوں کو تو مرنے دو، لیکن ان کی آنے والی نسل کی پرورش اور تربیت اپنے زیرِ نگرانی کرو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا، اور جب یہ نئی نسل پروان چڑھی تو اس نے مملکتِ خداداد کو مستحکم ہی نہیں بلکہ اسے سطوتِ داؤدی اور شوکتِ سلیمانی سے اس طرح ہمکنار کیا کہ ان کے عروج اور ترقی کی چمک دمک سے ایک عالم کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ لیکن اس کے

بعد، جب اس قوم میں وہ خرابیاں پیدا ہونی شروع ہوگئیں جو دولت اور قوت کے غلط استعمال کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں، تو وہ اس طرح تباہ ہوئی کہ اس کی نظیر بھی دنیا میں کہیں نہیں ملتی۔ ان کی پہلی تباہی، بابل کے بادشاہ، بخت نصر کے ہاتھوں (قریب 600 ق م میں) اسی طرح ہوئی کہ اس نے یروشلم کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور عام قتل وغارت گری کے بعد، جو یہودی باقی بچے، انہیں ڈھور ڈنگر کی طرح ہانک کر بابل لے گیا۔ جہاں وہ قریب ایک سو سال تک غلامی کی بدترین مصیبتوں کا شکار رہے۔ لیکن انہیں بازآفرینی کا ایک اور موقعہ دیا گیا اور ایران کے خداترس حکمران، سائرس (ذوالقرنین) نے، انہیں بابل کی غلامی سے رہائی دلا کر، دوبارہ یروشلم میں لا بسایا۔ اس کے بعد، ان پر پھر وہی خرابیاں عود کر آئیں تو آخری حجت کے طور پر، ان کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام جیسا عظیم پیغامبر انقلاب مبعوث ہوا۔ لیکن انہوں نے جب ان کی دعوت کی مخالفت کی اور اپنی سرکشی سے باز نہ آئے تو ان کی آخری تباہی، رومیوں کے گورنر ٹائیٹس کے ہاتھوں (70ء میں) اس طرح عمل میں آئی کہ وہ قریب دو ہزار سال تک خانماں خراب، بے گھر بے در، زمانے کی ٹھوکریں کھاتے پھرے، تا آنکہ اب انہیں، مغربی طاقتوں کے تصدق، دھاندلی سے فلسطین میں رہنے کا ٹھکانہ ملا۔

## خرابیوں کی فہرست:

جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے، قرآنِ کریم نے ان کے جرائم کی فہرست بڑی تفصیل سے دی ہے لیکن (بغرض اختصار) یہاں ان میں سے صرف ان جرائم کو سامنے لایا جاتا ہے جو زیادہ نمایاں تھے مثلاً:

1۔ ان کے معاشرہ کی بنیاد سرمایہ داری اور مذہبی پیشوائیت کے اقتدار پر تھی۔ (9:34)

2۔ نظامِ سرمایہ داری کی بنیاد، ربٰو پر ہوتی ہے یعنی اس اصول پر کہ معاوضہ محنت کا نہیں بلکہ سرمایہ کا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں ربٰو کا چلن عام تھا حالانکہ ان کے رسولوں نے انہیں اس سے سختی سے روکا تھا۔ (4:161)

3۔ ربٰو کے علاوہ، وہ دوسرے کا مال ہر جائز و ناجائز طریقے سے ہتھیا لیتے اور ہضم کر جاتے تھے (4:161) اس سلسلہ میں، ان کی ہوس وزر پرستی کس حد تک پہنچ چکی تھی، قرآنِ کریم نے اسے اس مقدمہ کے ضمن میں بیان کیا ہے جو حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے پیش ہوا تھا۔ مدعی کی فریاد یہ تھی کہ مدعا علیہ مجھے کہتا ہے کہ میں تمہارا بھائی ہوں اور ہے بھی یہ بھائی۔ اس کے پاس ننانویں بھیڑیں ہیں اور میرے پاس صرف ایک بھیڑ ہے۔ یہ میرا بھائی مجھ سے کہتا ہے کہ تم یہ ایک بھیڑ بھی مجھے دے دو تم نے اسے رکھ کر کیا کرنا ہے۔ یہ تھی اس قوم کی ذہنیت یا ان کا معاشی نظام۔

4۔ غریبوں اور محنت کشوں کی گاڑھے پسینے کی کمائی کے سلب ونہب سے، سرمایہ داروں کے دل میں اگر کبھی کوئی کھٹک پیدا ہوتی تھی تو مذہبی پیشوا اسے یہ کہہ کر مٹا دیتے تھے کہ تم صدقہ وخیرات سے جو نیکی کے کام کرتے ہو، ان کا ثواب بہت بڑا ہے۔ قرآن کریم نے ان کی اس خود فریبی کی بڑے دل نشیں انداز سے نقاب کشائی کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تمہارا حال یہ ہے کہ تم

پہلے اپنے ہاں کے غریب اور کمزور لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال دیتے ہو اور جب انہیں دوسرے لوگ پکڑ کر لے جاتے ہیں تو تم انہیں فدیہ دے کر چھڑا لاتے ہو۔ اور اپنے دل میں خوش ہو جاتے ہو کہ ہم نے بہت بڑا ثواب کا کام کیا ہے اور اسے فراموش کر دیتے ہو کہ جس مصیبت میں یہ غریب گرفتار ہیں اس کے ذمے دار تم خود ہو۔ یاد رکھو تمہارے صدقہ وخیرات کے اس قسم کے کام، اس جرم کا کفارہ کبھی نہیں بن سکتے۔ تمہاری اس روش کا نتیجہ یہ ہوگا کہ: خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ (2:85)۔ اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلیل وخوار ہو گے اور آخرت میں بھی سخت عذاب میں مبتلا۔

5۔ معاشرہ میں جو برائیاں پیدا ہو جاتی تھیں، نہ تو وہ ایک دوسرے کو ان سے روکتے تھے (5:79) اور نہ ہی ان کے مذہبی پیشوا انہیں ان سے باز رہنے کی تلقین کرتے تھے۔ (5:63) کیونکہ ان کے اپنے مفاد ان کے ساتھ وابستہ ہوتے تھے۔

6۔ ان کے اکابرین ملت (لیڈرانِ کرام) کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ لوگ ان کاموں پر ان کی تعریف کریں، جو وہ کر کے نہ دکھائیں لوگ ان کی تعریف میں قصیدے پڑھتے رہتے تھے اور وہ ان قصیدوں کو سن سن کر خوش ہوتے تھے۔ (3:178)۔

7۔ مذہبی پیشوائیت کے اقتدار کا یہ عالم تھا کہ لوگوں نے علماء ومشائخ کو اپنا خدا بنا رکھا تھا (9:31) کسی کو ان کے فیصلوں سے مجال سرتابی نہ تھی۔

8۔ عوام کی یہ حالت تھی، اور ان کے مذہبی پیشواؤں کی یہ کیفیت کہ:

ا۔ وہ غرور، نفرت اور تکبر وتمرد کے پیکر تھے۔ ان سے اگر کوئی علم وعقل کی بات کی جاتی تو وہ اُسے یہ کہہ کر دھتکار دیتے کہ ہمارا علم مکمل ہے ہمیں کسی سے کچھ سیکھنے کی ضرورت نہیں۔ (2:88)

ب۔ مذہب اُن کا پیشہ تھا اور وہ چند ٹکڑوں کی خاطر، جس قسم کا چاہو، فتویٰ دے دیتے تھے (7:169) اور پھر تماشہ یہ کہ وہ ان فتووں کو اپنے ہاتھوں سے لکھتے تھے۔ لیکن لوگوں سے کہتے یہ تھے کہ یہ خدا کی شریعت ہے جسے ہم تمہارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ (3:79)

ج۔ اسی دین فروشی کا نتیجہ تھا کہ ان کی ہر ممکن کوشش یہ ہوتی تھی کہ لوگ خدا کے راستے کی طرف نہ آنے پائیں اس لیے وہ ہر اس آواز کو سختی سے دبا دینے کی کوشش کرتے تھے جو لوگوں کو حق وصداقت کی طرف دعوت دے۔ (9:34)

د۔ وہ مختلف فرقوں میں بٹے ہوئے تھے جن میں ہمیشہ سر پھٹول ہوتی رہتی تھی اور ان کی یہ فرقہ بندی اور اختلاف انگیزی کسی اصول کی بنا پر نہیں تھی بلکہ باہمی ضد اور رقابت کی وجہ سے تھی (45:17) ان کا سارا وقت ایک دوسرے کو کافر قرار دینے میں صرف ہو جاتا تھا۔ (2:113)

ر۔ وہ جو کچھ دوسروں سے کہتے اس پر خود کبھی عمل نہیں کرتے تھے۔ ان کے علم وفضل کی کیفیت بس یوں سمجھئے جیسے کسی نے گدھے پر مقدس کتابوں کا انبار لاد دیا ہو۔ (62:5)

س۔ وہ لوگوں کو اس خوش فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ تم جو کچھ جی میں آئے کرو، جنت تمہارے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ تم کبھی جہنم میں نہیں جاؤ گے اور اگر کسی وجہ سے تمہیں جہنم میں بھیج بھی دیا گیا تو تمہارے بزرگ فوراً جا کر تمہیں چھڑا لائیں گے (2:50) تم تو خدا کی چاہتی اولاد ہو۔ وہ تمہیں کیسے جہنم میں ڈال دے گا۔ (5:18)

(9) قوم کو اعمال سے بیگانہ بنا دینے کا نتیجہ یہ تھا کہ قانون اور ضابطہ کی چھوٹی چھوٹی پابندیاں بھی ان پر شاق گزرتی تھیں۔ مثلاً انہیں کہا گیا کہ ہفتے میں ایک دن کاروبار کا ناغہ کیا کرو (جسے سبت کہتے ہیں) تو وہ ایسے حیلے اختیار کرنے لگ جاتے جن سے وہ کسی نہ کسی طرح اس پابندی سے بچ جائیں۔ قانون کی طرف سے گریز کی راہیں نکالنا ان کا عام معمول بن چکا تھا۔ (7:163۔164)

(10) ظاہر ہے کہ جس قوم کی حالت یہ ہو چکی ہو، وہ کسی بلند مقصد کی خاطر ذرا سی قربانی بھی نہیں دے سکتی، اور جب وہ کسی چھوٹی موٹی قربانی کے لئے بھی آمادہ نہیں ہو سکتی تو حق کی خاطر جان دینے کا تو ان کے ہاں سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ کیفیت ان کی یہ تھی کہ موت کے نام سے ان کی جان جاتی تھی (2:96، 62:8) نتیجہ یہ کہ ان کی ہزاروں لاکھوں کی جمعیت باہر نکلتی تھی لیکن جب دشمن سامنے سے آتا دکھائی دیتا تو وہ بھیڑوں، بکریوں کی طرح بھاگ اٹھتے اور ذلت کی موت مر جاتے۔ (2:243)

(11) اسی ذہنیت کا نتیجہ تھا کہ ان کے ہاں، اور تو اور، فوج کی جرنیلی کا معیار بھی دولت بن چکا تھا۔ یعنی ان مناصب کے لئے امیروں اور رئیسوں کے لڑکے منتخب کئے جاتے تھے۔ جوہر ذاتی کو کوئی نہیں پوچھتا تھا۔ (2:248) اور سپاہیوں میں ڈسپلن اس حد تک مفقود تھا کہ اگر ان سے کہا جاتا کہ کچھ وقت کے لئے پیاس کو روکو، پانی مت پیو تو وہ اتنی سی پابندی بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے (2:249)۔

یہ تھی اس قوم کی حالت جب، خدا کی آخری حجت، اور بنی اسرائیل کا آخری پیغامبر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کی طرف مبعوث ہوئے۔

(جاری ہے)

## سانحہ ارتحال

بزم چینوٹ کے نمائندہ آفتاب عروج صاحب انتقال کر گئے ہیں۔ وہ فرقہ ورانہ منافرت سے مبرّا مدلل گفتگو کرتے۔ نہایت خوبصورت شخصیت آخری سانس تک انسانیت سے محبت کا درس دیتے رہے۔ اپنی محفل کے دوستوں کو زندگی بھر یاد رہیں گے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو کروٹ کروٹ جنت عطا کرے اور پس ماندگان کو صبرِ جمیل سے نوازے ادارہ مرحوم کے اعزہ واقرباء کے غم میں برابر کے شریک ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر1)

# اِنسانی ذات کی تخلیق اور اِس کے مقصد کے فہم کی تلاش

پیدائش کے آغاز ہی میں جب ہم اپنی طرف دیکھتے ہیں تو اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا کہ ہمارے دِل میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ ہمیں کس نے تخلیق کیا ہے اور ہماری ربوبیت/ پرورش کون کر رہا ہے۔؟ ہمیں اِس میں شک نہیں ہوتا کہ ہمارا خالق ہم سے بہت زیادہ طاقت رکھتا ہوگا۔ آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزریے اور روئے زمین کی کسی خطہ پر نگاہ ڈالئے، ایک چیز آپ کو بلا لحاظ زمان ومکان، بالعموم تمام نوع انسانی میں مشترک نظر آئے گی، یعنی کسی بلند و بالا ہستی کا تصور، کسی فوق البشر قوت کا احساس ہوگا۔ اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ جہاں اس قسم کی قوت کا احساس ہر جگہ موجود ہے، اس کا تصور اور اس کی تفاصیل ہر مقام پر مختلف ہیں۔ ایک ہی ملک میں ایک قبیلے کا ''معبود'' دوسرے قبیلے کے معبود سے نہیں ملتا۔

## اللہ کا بطور خالقِ اِنسانی ذات کا تصور:

جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ انسان کے ذہن میں خدا (یعنی کسی مافوق الفطرت ہستی یا قوت) کا خیال پیدا کیسے ہوا۔ مغرب کے علمائے عمرانیات کا (آج سے کچھ عرصہ پہلے تک) یہ خیال تھا (اور اب بھی وہاں اس خیال کے موید لوگ ملتے ہیں کہ) جب ابتدائی دور کے انسان نے (جب اس کا شعور ہنوز عہد طفولیت میں تھا) یہ دیکھا کہ بعض حوادث ایسے آتے ہیں جن کے علل و اسباب کا اسے کوئی پتہ نہیں چلتا (مثلاً بجلی کی کڑک، بادلوں کی گرج، طوفانِ بادوباراں، زلزلے، وبائی امراض وغیرہ) تو اس کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہو نہ ہو ان حوادث کے پیچھے کوئی بڑی بڑی قوتیں ہیں جو دکھائی نہیں دیتیں۔ اس سے اس کے ذہن میں ''خدا'' (دیوی، دیوتاؤں) کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال وظروف اور مختلف قبائل کے احوال وکوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا گیا اور انسانی ذہن میں پختگی آتی گئی اس تصور میں بھی جِلا اور لطافت پیدا ہوتی گئی۔ اس طرح بتدریج ''خدا'' کا وہ تصور وجود میں آ گیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس نظریہ کو ''خدا کا ارتقائی تصور'' کہا جاتا ہے۔

خدا کی ایسی قوتیں جن کے لئے عمومی طور پر اِلٰہَ، اِلَیۡہِ، یَاۡلَہُ کے الفاظ بولے جاتے تھے جس کے معنی ہیں گھبرا کر کسی کی پناہ ڈھونڈنا یا متحیر ہونا ہیں۔ اَلَہَ، یَاۡلَہُ کے معنی یہ بھی ہیں کسی کو پناہ دینا، امان میں لینا۔ ان معانی کے اعتبار سے اِلٰہٌ کے معنی

ہوں گے ایک ایسی ہستی جس سے خطرات میں پناہ حاصل کی جائے، جس سے مشکلات دور کرنے کی استدعا کی جائے اور جس کی عظمت و بلندی کے تصور سے انسان متحیر ہو جائے۔ بعض کا خیال ہے کہ یہ لفظ ''لَاہَ، یَلِیْہُ'' سے مشتق ہے جس کے معنی بلند مرتبہ ہونا اور نگاہوں سے پوشیدہ ہونا ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ''اَلَہَ'' کے معنی ہیں وہ شخص غلام بن گیا اور ''اَلَّھَہٗ'' کے معنی ہے کہ اُس نے اسے غلام بنالیا۔ اس اعتبار سے ''اِلٰہٌ'' کے معنی ایسی ہستی ہوں گے جس کا غلبہ و اقتدار اختیار کیا جائے جس کے قانون کی اطاعت کی جائے جس کی محکومی اختیار کی جائے۔

آپ غور کیجئے کہ ذہن انسانی نے ''معبود'' کے جس قدر تصورات بھی قائم کیے ہیں، ان میں مندرجہ بالا خصائص کسی نہ کسی شکل میں ضرور پائے جاتے ہیں۔ ان کا بلند و بالا ہونا، نگاہوں سے پوشیدہ ہونا، اس کے تصور سے حیرت زدہ ہو جانا، مشکلات سے گھبرا کر اس کی طرف مدد کے لیے رجوع کرنا، تذلل و تعبد سے اس کے سامنے جھکنا اور اس کے احکام کی اطاعت کرنا۔ بالفاظ دیگر ''اِلٰہٌ'' وہ جامع لفظ ہے جو ''خدا'' کے ہر قسم کے تصور کو محیط ہے۔ اس طرح انسان کے ذہن میں ''خدا'' کا تصور پیدا ہوا۔ یہ تصور مختلف ممالک کے احوال و ظروف اور مختلف قبائل کے ماحول و کوائف کے ماتحت مختلف تھا۔ اس کے بعد جوں جوں زمانہ آگے بڑھتا اور انسان ترقی کرتا گیا اس تصور میں بھی جلا پیدا ہوتا گیا۔ اس طرح بتدریج ''خدا'' کا وہ تصور وجود میں آ گیا جو دنیا کے بلند مذاہب کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس کو اللہ کا ارتقائی نظریہ کہا جاتا ہے۔ مشہور یونانی مورخ، پلوتارک (PLAUTARCH-AD 42-107) اس باب میں لکھتا ہے:

زمین پر چلتے پھرتے تم ایسے شہر بھی دیکھو گے جن کی دیواریں نہیں ہیں۔ ایسے بھی جن میں سائنس کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی، ایسے بھی جہاں حکمران کوئی نہیں، ایسے بھی جہاں نہ محلات ہیں نہ ورزش گاہیں، نہ تھیٹر لیکن تم کوئی ایسا شہر نہیں پاؤ گے جہاں دیوتاؤں کے مندر نہ ہوں، جہاں دعائیں نہ مانگی جاتی ہوں، جہاں منتیں نہ مانی جاتی ہوں۔ ایسا شہر نہ آج تک کسی انسان نے دیکھا ہے نہ کبھی دیکھنے میں آئے گا۔

جس قسم کا خدا کا تصور کسی کے ہاں ہوگا، اسی قسم کی اس فرد کی زندگی اور اس جماعت (یا قوم) کا معاشرتی نقشہ ہوگا۔ یہ غالباً مغربی مفکر کانٹ تھا جس نے کہا تھا کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے کس قسم کا معبود پرستش کے لیے اختیار کر رکھا ہے اور میں تمہیں اس قوم کی تہذیب و تمدن کے متعلق سب کچھ بتا دوں گا۔

## مذاہب میں الٰہ کا تصور:

مذہب کی بنیاد ہی خدا کے ایمان پر رکھی جاتی ہے۔ مختلف مذاہب میں خدا کا نام بدل جائے گا لیکن اس کی ہستی کا اقرار، اس پر ایمان، ہر جگہ شرط اولین ہوگا۔ اس سے لازماً یہ سوالات سامنے آتے ہیں کہ خدا کیا ہے؟ وہ کیسا ہے؟ اسے ماننا کیوں ضروری ہے؟ اس کے نہ ماننے سے کیا ہوتا ہے؟ انسان اور خدا کا باہمی تعلق کیا ہے؟ یہ سوالات جیسا کہ ظاہر ہے بڑے اہم، بڑے مشکل اور بڑے نازک ہیں اور جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ان کے اطمینان بخش جواب کے لیے

مصروفِ تحقیق وکاوش ہے۔

اہل کتاب میں یہودیت میں اسرائیل کے بادشاہ فرعون نے کہا کہ میرے سوا کوئی الٰہ نہیں۔" اس سے الٰہ کے معنی واضح ہوجاتے ہیں۔ حضرت موسیٰؑ کی دعوت یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو فرعون کی محکومی سے نکال کر آزادی کی فضا میں بسایا جائے، جہاں وہ خالص خدا کے احکام کی اطاعت کریں۔ فرعون کا دعویٰ یہ تھا کہ اس کی مملکت میں اطاعت وفرماں پذیری اسی کی ہوسکتی ہے، اس لیے بنی اسرائیل کو اجازت نہیں دی جاسکتی کہ وہ کسی اور کے قوانین کی پابندی اختیار کرلیں۔ اس سے ظاہر ہے کہ شرک یہی نہیں کہ انسان پتھر کی مورتیوں کے سامنے سجدہ ریز ہو، اس سے کہیں بڑا شرک یہ ہے کہ انسان قوانین خداوندی کی جگہ انسانوں کے خودساختہ قوانین کی اطاعت کرے۔

اہلِ کتاب میں عیسائیت میں خدا کے تصور میں تثلیث کا عقیدہ پایا جاتا تھا۔ عیسائی تین خدا مانتے ہیں: باپ، بیٹا، روح القدس۔ یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ (5:73)

''بلاشبہ وہ لوگ (حق سے) منکر ہوئے جنہوں نے کہا کہ خدا تین میں ایک کا ہے۔ حالانکہ بجز اس ایک الٰہ کے اور کوئی الٰہ نہیں۔''

یونان کے اقنوم ثلاثہ کا عقیدہ جو آریہ ورت میں آکر روح، مادہ اور خدا کا عقیدہ بنا، وہ بھی تبعاً اسی میں شامل ہے۔

## دیگر مذاہب کا خدا کے تصور میں شرک کا داخلہ:

مجوسی (پارسی، جو اپنے آپ کو جناب زرتشت کے پیرو کہتے ہیں) دو مستقل خدا مانتے ہیں۔ ایک نیکی کا خدا، ایک برائی کا، ایک نور کا خدا، ایک ظلمت کا۔ قرآن کریم نے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمادی۔

وَقَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ ۚ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ۚ فَاِيَّايَ فَارْهَبُوْنِ (16:51)

''اور اللہ کا حکم تو یہ ہے کہ دو الٰہ اختیار نہ کرو، الٰہ وہی ایک ہے۔ سو تم لوگ صرف اسی کے قانون کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج سے خوف کھاؤ۔''

اِس میں شبہ نہیں کہ بعض مذاہب، مثلاً بدھ مت، ایسے ہیں جو خدا کی ہستی کے منکر ہیں لیکن خود بدھوں کی حالت یہ ہے کہ وہ مہاتما بدھ کی خدا کی طرح پرستش کرتے ہیں، سو فرق صرف نام کا ہے، تصور ہر جگہ وہی ہے۔

اہل کتاب نے مذہبی احبار ورہبان، علماء ومشائخ کو خدا کا شریک بنالیا تھا۔ یہ عقیدہ انسانی عظمت وتقدس کا نقاب اوڑھ کر عقیدت وارادت کے راستے رگ وپے میں سرایت کرجاتا ہے اور کچھ اس طرح دل کی گہرائیوں میں اپنا گھر بنالیتا ہے کہ اس کا استیصال بہت مشکل ہوجاتا ہے۔

اِتَّخَذُوْٓا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَالْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوْٓا اِلٰهًا

وَّاحِدًا ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ؕ سُبْحٰنَهٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (9:31)

''انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر اپنے علماء ومشائخ کو خدا بنالیا اور مسیح ابن مریم کو بھی۔ حالانکہ ان کو حکم یہی دیا گیا تھا کہ وہ اسی ایک الٰہ کی عبودیت اختیار کریں جس کے سوا کوئی دوسرا الٰہ نہیں۔ وہ ان کے شرک سے بلند ہے۔''

ان محسوس شکلوں کے علاوہ قرآن کریم شرک کی ایک ایسی شکل بیان کرتا ہے جسے انسان کی آنکھ بھانپ نہیں سکتی تھی۔ اس غیر محسوس شے کو شرک قرار دینا صرف اس خدائے علیم وبصیر کا کام ہے جو دل کی گہرائیوں میں گزرنے والے خیالات سے بھی واقف ہے۔ فرمایا:

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّخَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۳﴾ (45:23)

''کیا تو نے اس کی حالت پر بھی غور کیا جس نے اپنی خواہشات ہی کو اپنا الٰہ بنالیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قانون خداوندی نے اسے باوجود علم کے گمراہ کر دیا اور اس کے کانوں پر اور قلب پر مہر لگا دی اور اس کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ صحیح راستہ کی طرف راہ نمائی اللہ کے قانون کے مطابق ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ کیا تم پھر بھی نصیحت نہ حاصل کرو گے؟''

ان آیات مقدسہ کو سامنے رکھئے اور پھر کسی عصر حاضر کی مہذب دنیا پر نگاہ ڈالئے اور کبھی اپنے دل کے نرم ترین گوشوں کو ٹٹولئے اور دیکھئے کہ حقائق وبصائر کی کتنی دنیائیں اس ایک ٹکڑے کے اندر پوشیدہ ہیں۔ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایک سے زیادہ الٰہ مقرر کر لینے سے فساد رونما ہو جاتا ہے۔ غور کیجئے کہ آج یہ جو ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے تو کیا اس کی یہی وجہ نہیں کہ ہر انسانی قلب، صنم کدہ بن رہا ہے؟ ہر گروہ اور ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھی ہے اور اس ''خدائے خواہشات وجذبات'' کے تغلب وتسلط میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔

یہ شرک کی وہ خوفناک اور بھیانک گھاٹی ہے جہاں سے پھسل کر انسان سیدھا ہلاکت اور بربادیوں کے ہولناک جہنم میں جا گرتا ہے۔ مذاہب کی دنیا میں ہر مذہب میں اعتقادی دعوؤں کے حق میں کوئی ایک بھی عِلم کی سند پر تسلی بخش ثبوت پیش کرنے کی ضرورت ہی محسوس نہیں کی گئی۔ عیسائی سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت آگے کر دے گا، کسی ہندو سے پوچھیں تو وہ اپنی کتابیں آگے کر دے گا، کسی مسلمان سے پوچھیں تو وہ اپنی کتاب بطور ثبوت پیش کر دے گا۔ سب کی ایک ہی بات کہ ہماری کتاب خدا نے ہدایت کے لئے بھیجی۔ سب کی اپنی اپنی تاویلات ہیں جن سے وہ اپنے اپنے خدا کو اپنے دعووں کے حق میں ثابت کرتے ہیں، گویا یہاں بھی کوئی خدائی عِلم کی مداخلت سے نہیں، بلکہ انسان خود اپنی طرف سے پیش کردہ تاویلات سے خدا کے وجود کو منوا رہا ہے۔ بہرحال یہاں کوئی ایسا طریقہ نہیں کہ جس پر چل کر خدا کو مانا جائے اور منوایا جائے۔ صرف ایمان بالغیب ہے جو کسی خدا کو مان سکتا ہے اور منوا سکتا ہے۔ صرف چند وہم ہیں خوف کی صورت جو خدا پر ایمان رکھا جاتا ہے۔ حقیقت وصداقت کے راستے معجزات وعقائد کی راہنمائی میں طے نہیں کیے جا سکتے، اور نہ ہی کبھی ایسا ممکن ہوا ہے۔ سچائی کو کسی

خدا سے منسوب کرنے کی ضرورت اضافی نوعیت کی رہ گئی ہے۔ ایسے میں خدا پر یقین رکھنا ایسا ہی ہوگا جیسے بچے زمانہ طفلی میں سپرمین، سپائیڈرمین وغیرہ کی موجودگی پر یقین رکھتے ہیں۔

## ذہنِ انسانی کا پیدا کردہ خدا:

زمانہِ قدیم میں اِنسان اپنے ذہن سے تراشیدہ خدا کی اِنسانی تخلیق کے بارے سوچتا رہتا تھا۔ اگر انسان کے دو ہاتھ ہیں، تو خدا کے چار ہاتھ بنا دیے جائیں گے۔ انسان ایک پتھر اٹھا سکتا ہے تو خدا ایک پہاڑ اٹھالے گا۔ انسان کا قد پانچ چھ فٹ کا ہوتا ہے، خدا کا قد پچاس ساٹھ فٹ کا ہو جائے گا۔ ہندوستان کے دیوی دیوتا اور اصنامیات یونان کے مجسمے اسی تصور کے مظاہرات ہیں۔ انسان کا ذہن، انسان اور مظاہر فطرت سے الگ ہو کر خدا کا کوئی تصور پیدا ہی نہیں کر سکتا۔

ویدوں میں خدا کا تصور ہے کہ برہمن اس کے منہ سے (پیدا) ہوئے اور اس کے بازوؤں سے کشتری ذات کے لوگ پیدا ہوئے جو ویش ہیں، وہ اس کی ٹانگوں سے پیدا ہوئے اور پرمیشور کے دونوں پاؤں سے بیچارے شودر پیدا ہوئے۔ چاند اس کے منہ سے پیدا ہوا اور آنکھوں سے سورج پیدا ہوا۔ منہ سے اندر اور اگنی دیوتا پیدا ہوئے اور سانس سے ہوا پیدا ہوئی!

وہ سانپوں، اُسترے اور بخار کو سجدہ کرتے بھی دکھائی دے جاتے۔ اوتار کا عقیدہ بھی انسان کے اسی رجحان کا آئینہ ہے اس نے جہاں کسی انسان میں کوئی ایسا جوہر دیکھا جو عام انسانوں میں کم ملتا ہے اسے فوراً فوق البشر کی شکل میں خدا تصور کر لیا قرآن کریم نے ہمیں بتایا ہے کہ جب سے انسان میں تمدنی شعور بیدار ہوا خدا کی طرف سے بوساطت انبیائے کرامؑ، وحی کے ذریعہ نوعِ اِنسانی کی طرف رہنمائی آنا شروع ہوگئی۔ اس راہنمائی کا نقطہ ماسکہ خدا کے متعلق صحیح تصور تھا اور ظاہر ہے کہ جب خود علم (وحی) کا سرچشمہ ایک ہی (خدا) تھا تو یہ تصور بھی شروع سے آخر تک ایک ہی ہوگا (اور ایک ہی تھا)۔ لیکن ہوتا یہ رہا کہ ایک رسول آتا اور خدا کے اس بلند و بالا تصور کو نہایت وضاحت سے پیش کر دیتا۔ کچھ عرصہ کے بعد یہ حقیقت لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتی اور محسوسات کا خوگر انسان، الوہیت کے اس صاف اور شفاف تصور میں اپنی ذہنی رنگ آمیزی کرنے لگ جاتا۔ کبھی وہ ان چیزوں کو اپنا معبود بنا لیتا جن سے وہ ڈرتا اور خوف کھاتا، کبھی ان کو جن سے وہ اپنی کچھ توقعات وابستہ کرتا۔ کبھی ان ذہنی اور خیالی معبودوں کی عظمت و تقدیس کے پیش نظر ان کے مجسمے کھڑے کرتا، بت تراشتا چنانچہ یہ مختلف دیوی دیوتا، اندر، اگنی، سورج، چاند، گنگا، جمنا، سانپ، گائے، بیل، سب اسی جذبہ خوف و امید (یعنی دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت) کے اظہار کی مختلف شکلیں ہیں۔ جب ذہن انسانی پر اس طرح توہم پرستی کی تاریکیاں چھا جائیں تو پھر ایک اور رسول آجاتا اور خدا کے پاکیزہ تصور کو وحی کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیتا اور انہیں واضح الفاظ میں بتا دیتا کہ انسان اشیائے کائنات کا مسجود ہے، ساجد نہیں۔ اس میں ایسی صلاحیتیں رکھ دی گئی ہیں جن کی رو سے یہ اشیائے فطرت کو مسخر کر سکتا ہے اور ان سے اپنی مرضی کے مطابق کام لے سکتا ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک خدا کی ذات کا تعلق ہے اس کی کنہ و حقیقت اور ماہیت و کیفیت کا سمجھنا انسانی ذہن کے بس کی

بات نہیں۔ایک محدود (FINITE) ذہن، لامحدود (INFINITE) کا تصور کر ہی نہیں سکتا۔خدا تو بہت بڑی چیز ہے۔دور حاضر کے مفکرین اور سائنسدان ہمیں بتاتے ہیں کہ زمان (TIME) کی کوئی ابتدا نہیں اور مکان (SPACE) کی کوئی حد نہیں۔یعنی یہ کہنا غلط ہے کہ زمانہ فلاں وقت سے شروع ہوا اور کائنات کی فضا کا آخری کنارہ وہ ہے۔نہ زمانہ کا کہیں سے آغاز ہوا، نہ خلاء کا کوئی آخری کنارہ ہے۔فلسفہ اور سائنس ہمیں یہ بتاتے ہیں، لیکن آپ اپنے ذہن پر زور ڈالئے اور ایک ''لاابتدا'' یا ''لاانتہا'' مکان کا تصور قائم کرنے کی کوشش کیجئے۔آپ دیکھیں گے کہ آپ کے ذہن میں ان کا تصور آ ہی نہیں سکتا۔آپ جتنا زیادہ ذہن پر زور ڈالیں گے اتنی ہی جلدی آپ جھنجلا اٹھیں گے۔سو جب زمان اور مکان کے تصور کی یہ حالت ہے، تو خدا کی ذات کا تصور (جو زمان و مکان کا خالق ہے)) کس طرح انسان کے حیطہ ادراک میں آ سکتا ہے؟

قدیم یونانی حکماء نے عقل کا استعمال کرتے ہوئے اپنے زمانہ کے عِلم کی روشنی میں دیوی، دیوتاؤں کے تصورِ خالقِ کائنات سے لوگوں کو چھٹکارا دلوایا۔عقلی توجیہات سے بطور خالقِ کائنات اللہ کا تصور پیش کرنے کا سہرا تھالیس کو جاتا ہے۔وہ آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ ہمارے دور سے پیشتر 624 قبل مسیح پیدا ہوا اور 556 قبل مسیح فوت ہوا۔

## قدیم یونانی فلاسفروں کا نظریہ ارتقاء:

فلسفہ کے علم کی ابتدا کا سہرا تھالیس (Thales) کے سر پر باندھا جاتا ہے۔وہ آج سے 26 سو سال کے لگ بھگ ہمارے دور سے پیشتر 624 قبل مسیح پیدا ہوا اور 556 قبل مسیح فوت ہوا۔اصولی طور پر اُس نے یہ نظریہ دیا کہ تمام مادی اشیاء کا بنیادی مادہ پانی ہے اور یہ کہ ہر چیز پانی سے نکلی ہے اور آخر کار دوبارہ پانی میں مِل جائے گی۔

انسانی تاریخ میں یہ پہلا ثبوت اور کوشش تھی کہ کائنات کو کسی خیالی یا تصوراتی طریقے پر بیان کرنے کی بجائے کائنات کی حقیقت کو فطری اور سائنسی طریقے پر انسانی مشاہدہ سے ثابت کیا جائے۔

اُس کے بعد اناکسی مینڈر (Anaximander) کا تصور سامنے آتا ہے جو تھیلس کے اس اصول سے مُتفق تھا کہ مادی اشیاء کا بنیادی یا حتمی اصول مادہ ہی ہے، لیکن اس نے مادہ کو پانی کا نام نہیں دیا اُس کے خیال میں اشیاء کا اصول جامد مادہ تھا وہ بے صورت، غیر متعین اور لامحدود تھا، جو مُختلف مراحل سے گُزر کے مُختلف اشکال اختیار کر لیتا تھا۔

اُس کے بعد اناکسی مینیز (Anaximenes) نے اپنے پیشرو کی طرح بے صورت، غیر متعین، لامحدود اور بے نام مادے کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ اُس نے کائنات اور مادی دنیا کا بنیادی اصول ہوا کو قرار دیا۔اُس نے کہا کہ یہ ہوا بھی غیر متعین مادے کی طرح خلا میں پھیلی ہوئی ہے اور مسلسل حرکت میں ہے۔یہی حرکت کا اصول ہوا کی بنیادی فطرت میں موجود ہے اور یہی اصول کائنات کے وجود میں آنے اور اس کے ارتقاء کا باعث بنا ہے۔

اِس مسلۂ کا حل فیثاغورث (Phythagoreas) نے یوں پیش کیا ہے کہ:

مختلف چیزوں کے خواص میں اتنے زیادہ اختلاف ہونے کے باوجود ان سب میں ایک صفت یا خاصیت آفاقی نوعیت

کی پائی جاتی ہے جو کائنات کی ہر چیز میں یکساں موجود ہے، چاہے وہ چیز مادی یا تجریدی (خیالی) ہے۔ وہ صفت یہ ہے کہ دنیا کی تمام چیزیں عددی ہیں اور یہ کہ اُن کو گِنا جا سکتا ہے۔

علاوہ ازیں کسی ایسی کائنات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا، جس میں ''ہندسوں'' اور تعداد کا تصور نہ ہو۔ فیثاغورث کا کہنا تھا کہ کسی ایسی کائنات کا تصور تو کیا جا سکتا ہے، جس میں رنگ، ذائقہ نہ ہو اور بے وزن ہوں لیکن کسی دنیا کا تصور نہیں کیا جا سکتا جس میں ہندسوں کا وجود یا ضرورت نہ ہو یا تعداد کا بالکل تصور ہی نہ ہو۔ یہی دنیا کے وجود میں آنے کے بنیادی اصول کا اہم ترین پہلو ہے۔

ہراکلیٹس 535 قبل مسیح میں پیدا ہوا اور کہا جاتا ہے کہ اس کی وفات 475 قبل مسیح ہوئی ہے۔ اُس کے بقول" تمام اشیاء آگ سے وجود میں آئی ہیں اور اسی میں واپس مِل جائیں گی۔

ہُراکلیٹس ؟ کا نظریہ تھا کہ آگ دراصل تغیر کی صورت ہے، اِس لئے تغیر و تبدیل کا عمل ہی حقیقی ہے۔ اس کے برعکس وجود یا مُستقل صورت کا قیام سب فریبِ نظر ہے۔ اُس کا مشہور قول ہے کہ حرکت اصل حقیقت ہے۔ دنیا کی ہر چیز مسلسل تغیر و تبدیل کے عالم میں ہے اور نئی نئی صورتیں اختیار کر رہی ہیں۔

ہراکلیٹس کہا کرتا تھا کہ چیز بظاہر یعنی باہر سے اگر ویسی ہی ہو جیسے پہلی تھی تو یہ صِرف اس کے مادے کے حُجم کی وجہ سے ہے لیکن اصل مادہ پہلے والا نہیں رہتا بلکہ بہتے دریا کے پانی کی طرح بدلتا رہتا ہے۔

اگر یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ مادے کی مُختلف قسموں کی بنیاد فطری طور پر ایک ہی مادہ ہے تو پھر مادے کی موجود عناصر یعنی ہوا، پانی، آگ اور مِٹی کی مُختلف خاصیتوں کا مسلۂ سامنے آ جاتا ہے کہ پھر یہ بظاہر مُختلف خاصیتیں ایک خاص یا مخصوص خاصیت کیسے اپنائیں گی۔ طبیعین کے نزدیک آگ و آب و خاک و باؤ (عناصرِ اربعہ) کائنات کے اساسی اجزاء ترکیبی ہیں۔

نظریہ ارتقاء کا آغاز فلسفہ مادیت سے ہوتا ہے جس کا ابوالآباء دیمقراطس کو قرار دیا جاتا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ ہر شے جواہر سے بنی ہے اور جواہر از روئے ہندسہ نہیں بلکہ مادی طور پر نا قابل تقسیم ہیں۔ ان قدیم مادئین کا خیال تھا کہ کچھ بھی ہو، یوں ہی (اتفاق سے) نہیں ہوتا بلکہ ہر بات کسی سبب کے باعث ہوتی ہے۔

وہ جواہر کو لایتجزیٰ کہتے ہیں اس نظریہ کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا تھا کہ:

1۔ یہ تمام لایتجزی اجزا مادی ہیں۔

2۔ ہر شے انہی ذرات سے مرکب ہے۔

3۔ جب یہ باہم مل کر کسی شے کو ترتیب دیتے ہیں، تو ان کے درمیان خلا رہ جاتی ہے۔

4۔ یہ ذرات نا قابل فنا ہیں۔

5۔ یہ ہمیشہ سے حرکت میں ہیں اور ہمیشہ حرکت میں رہیں گے۔

6۔ جواہر تعداد میں لامحدود ہیں۔

7۔ تمام اقسام کے جوہر کی نوعیت ایک ہی ہے۔ ان میں فرق صرف شکل اور جسامت کا ہے۔

8۔ نفس انسانی بھی انھیں اجزاء سے مرکب ہے اور انسانی فکر ان ہی اجزاء کی طبیعی ترتیب سے ظہور میں آتا ہے۔

عصرِ جدید میں بھی حکمائے مغرب تخلیقِ کائنات کی گتھیوں کو سُلجھانے میں لگے رہے، لیکن سمپسن کے نظریہِ ارتقاء کا آغاز اِس سوال سے اُٹھتا ہے کہ زندگی کی ابتداء کیسے ہوگئی؟ اُس کے نزدیک نہایت دیانتداری سے اس کا جواب یہ ہے کہ ہمیں اس کا کچھ علم نہیں۔

## اللہ کے تصورِ خالق کا جدید حُکماء مغرب کی ذہنی کاوشوں کا جائزہ:

آپ تاریخ انسانی کے کسی دور سے گزریے اور دنیا کے کسی خطہ پر نگاہ ڈالیے، ایک چیز، آپ کو ہر مقام، ہر قوم اور ہر زمانے میں اللہ کا تصور بطور قدر مشترک ملے گا، لیکن اِس کے بارے میں بھی کسی مفکر کا تصور دوسرے سے نہیں ملتا۔ وہ سبھی اپنے اپنے موضوع کی بنیاد پر خدا کا تصور پیش کرتے ہیں۔

1۔ کانٹ کے نزدیک ''خدا وہ ہے جو انسانوں کو اخلاقی ضابطہ دیتا ہے۔''

2۔ ولیم جیمز خدا کو ''کائنات کا حصہ اعلیٰ'' قرار دیتا ہے۔

3۔ میتھیو آرنلڈ کہتا ہے کہ ''خدا اس قوت کا نام ہے جو خیر کا سبب ہے۔''

4۔ سر جیمس جینز کے نزدیک ''خدا سب سے بڑا ریاضی دان ہے۔''

5۔ برگسان کے نزدیک خدا سے مفہوم ''تخلیقی توانائی'' رہا ہے۔

6۔ آئن سٹائن ذاتی خدا کے تصور سے نا آشنا تھا، اس کے برعکس وہ یہ کہتا تھا کہ انسان کو چاہئے کہ اپنے محدود وسائل کی مدد سے کارخانہ قدرت کا راز جاننے کی کوشش کرے، پھر اُسے پتہ چلے گا کہ اس تمام سلجھی ہوئی ڈور کے پیچھے نہایت لطیف انداز میں ایک غیر مادی اور نہ سمجھ میں آنے والی قوت کارفرما ہے، اس قوت کی ستائش اور تکریم، جو ہمارے فہم سے ماورا ہے، ہی میرا مذہب ہے!

ان چند مثالوں سے یہ حقیقت سامنے آگئی ہوگی کہ ''خدا'' کے صحیح تصور کے متعلق مفکرین کسی ایک نتیجے پر نہیں پہنچے۔ ان میں سے ہر ایک کا تصور الگ اور تعریف جداگانہ ہے، یہ اس لیے کہ جب یہ لوگ خدا کے متعلق بات کرتے ہیں تو یہ بات خدا کے متعلق نہیں ہوتی بلکہ اس تصور کے متعلق ہوتی ہے جو یہ خدا کے متعلق اپنے ذہن میں رکھتے ہیں۔ ہر فرد کے ذہن کا تراشیدہ تصور الگ ہوتا ہے، اس لیے ایک کا تصور دوسرے سے نہیں مل سکتا۔ شین کے الفاظ میں ''ایک فرد اور دوسرے فرد کا خدا

جداگانہ ہوگا۔ حتیٰ کہ ایک فرد کے احساسات وجذبات کی مختلف حالتوں میں بھی اس کا خدا مختلف ہوگا۔ ہر انسان اپنے جذبات کے تعمیر کردہ مندر کا پجاری ہے۔''

مغرب یعنی اہل کتاب کے مذاہب میں خدا کو وہ غیر مجسم روح سمجھا جاتا ہے جو جسم کی قید سے آزاد ہے۔ وہ ہر چیز دیکھ، سن اور جان سکتا ہے۔ المختصر وہ غیر جسمی ذہن یا عقل ہے، ایک ایسا شعور جو جسم سے الگ ہے مگر سوچنے، محسوس کرنے اور ارادہ کرنے اور اس پر عمل کرنے پر قادر ہے۔ خود جسم نہ ہوتے ہوئے بھی اجسام کی تخلیق اور انھیں محرک کرتا ہے اور محض ارادہ سے اشیاء کو وجود میں لاسکتا ہے۔ اِس کے ثبوت میں وہ عقل سے کئی دلائل دیتے ہیں۔ حُکمائے مغرب نے بہت سے دلائل دئے ہیں، لیکن ہم یہاں طوالت کے خوف سے بچنے کے لئے علامہ اقبال کی طرف سے دی گئی تین اہم دلیلوں کی نشاندہی کرنے پر ہی اِکتفاء کررہے ہیں۔

(1) کونی دلیل، (2) غایتی دلیل، (3) وجودی دلیل

یہ ادلہ ثلاثہ اگرچہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ فِکرِ انسانی نے جب کبھی ذات مطلق (واجب الوجود) کی جستجو کی تو چاروناچار انہی تین راستوں پر گامزن ہونا پڑا، لیکن منطقی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی دلیل بھی ذات مطلق کے اثبات پر دلالت نہیں کرتی۔ ان کے دلائل پر شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور اِسی تنقید کی وجہ سے حُکمائے مغرب خود اعتراف کررہے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکے۔

1۔ پہلی کونی یا علی دلیل:

کونی یا علی دلیل کا واضح ترین بیان یوں ہے کہ ہر شے کا ایک سبب (عِلت) ہوتا ہے اور اسی لیے کائنات کا بھی ایک سبب ہے جو خدا ہے۔ لہٰذا خدا کا وجود ہے۔

اِس دلیل کی رو سے کائنات ایک معلولِ منتہاہی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس کی کوئی عِلت بھی ہو۔ لیکن پھر ہر عِلت کے لیے چونکہ ایک دوسری عِلت کا وجود مستلزم ہے اور ذہن انسانی کے لیے ممکن نہیں کہ ایک ابدی تقہقر یعنی ماضی کی طرف ہٹتے ہوئے علت ومعلول کے ایک لامتناہی سلسلے کا تصور کرتا چلا جائے۔ اس لیے ایک ایسی علت، خدا کا وجود تسلیم کرنا پڑا جو کسی دوسری علت کا معلول نہیں۔ اِسے وہ عِلت اولیٰ، عِلت العلل اور یا پھر مسبب الاسباب کا نام دیتے ہیں۔

علی دلائل کا تجزیہ اور تنقید کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ سبب کسی زمانی وقوعہ یا عمل کا ہوا کرتا ہے لہٰذا یہ کہنا بہتر ہوگا کہ سبب کے بدلے کسی شے کا وجود میں آنے کا سبب ہوتا ہے۔ لیکن کیا کائنات ایک شے ہے؟ یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ لفظ ''کائنات'' ایک اسم جمع ہے اور کائنات اشیاء کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان تمام اشیاء کا جو موجود ہیں۔ علّی دلیل کا ناقد یہی اعتراض کرتا ہے کہ وقوعات کے منفرد اسباب کا طلب کرنا اور ان کے جوابات حاصل کرنا جائز ہے مگر وقوعات کے مجموعی سلسلہ کا

الگ سے سبب ڈھونڈنا بے معنی ہے۔

دوسرے ہم اگر یہ فرض کرلیں کہ مکمل کائنات کا سبب ڈھونڈنا معقول ہے اور اس کا جواب یہ ملتا ہے کہ اس کا سبب خدا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ خدا کا سبب کیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ''ہر شے کا سبب ہوتا ہے'' کا معنی خدا کے سوا ہر شے کا سبب ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہیوم نے کہا ہے کہ ہم کیوں اس جگہ علت و معلول کا سلسلہ ختم کرتے ہیں۔ اگر رکنا ہی ہے تو کیوں نہ ہم کائنات یا دنیا پر ہی علّی سلسلہ کا اختتام تسلیم کریں جسے ہم کسی حد تک جانتے ہیں اور جس کا ہمیں تجربہ بھی ہے۔ بہر حال تجربی اقلیم سے ماورا اسباب و علل کا سلسلہ لے جانا غیر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ اسباب کے متعلق ہمارا علم زمانی و مکانی اشیاء، اعمال و وقوعات تک محدود ہے، اس کے آگے اسباب کے متعلق کچھ کہنے کے ہم مجاز نہیں کیونکہ تجربات ہمیں اس قسم کی علّیت کے بارے میں کچھ بتانے سے قاصر ہیں۔

## 2۔ دوسری غایتی دلیل:

خدا کے وجود کے حق میں تمام دلائل میں سے مقبول ترین غایتی (مقصدی) دلیل ہے۔ یہ دلیل تجربی ذرائع سے دنیائے مشاہدہ کی بنا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ خدا کا وجود ہے۔ یہ دلیل اس بات کی طرف ہماری توجہ مبذول کراتی ہے کہ دنیا میں نظم اور مقصد کی بہت سی شہادتیں نظر آتی ہیں۔ اگر ہم دنیا کی ترتیب و تنظیم پر غور کریں تو اس نتیجہ سے احتراز ممکن نہیں کہ دنیا میں مقصد ہے اور یہ کہ اس کے پیچھے کسی عظیم معمار کا ہاتھ ہے اور وہی خدا ہے۔

علامہ اقبال کے الفاظ میں:

دلیل غائی میں معلول کی عِلت کا مطالعہ اس اعتبار سے کیا جاتا ہے کہ ہمیں معلوم ہو جائے اسکی نوعیت کیا ہے۔ لہٰذا جب عالم فطرت کے مشاہدے سے کچھ یوں نظر آتا ہے کہ اس کے اعمال و افعال میں پیش بینی غرض و غایت اور تطابق کے آثار پائے جاتے ہیں تو ہم سمجھتے ہیں ان سے ایک ایسی شاعر بالذات ہستی کا ثبوت مل جاتا ہے جس کے علم و قدرت کی کوئی انتہا نہیں۔

اسی کو کانٹ نے ان الفاظ میں خدا کے تصور سے روشناس کرایا ہے۔

We thus reach the idea of God as an individual necessarily existing, eternal, simple and all perfect supreme being, which is not the aggregate of finite realities but their unconditioned condition and ultimate cause.

ہم اسی طرح خدا کا ایک تصور ایسے فرد کا اخذ کرتے ہیں جس کی ذات لازمی، اندرونی، سادہ اور ہمہ گیر اقتدار کا وجود رکھتی ہے جو متناہی حقیقتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ ان کی مسبب الاسباب اور علت اولیٰ ہے۔

غایتی دلیل کا تجزیہ وتنقید میں کہا جاتا ہے کہ:

غایتی دلیل کی ابتدا اس بات سے ہوتی ہے کہ کائنات منظم ہے اور نظم نتیجہ ہے ترتیب وتنظیم کا۔ اہم ترین بات یہ ہے کہ اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ترتیب یا نظم ہمیشہ تنظیم کا نتیجہ ہے۔ جیسا کہ مغربی مفکر ہیوم نے کہا ہے ترتیب تنظیم کی شہادت اس صورت ہوتی ہے جبکہ یہ مشاہدہ ہوا ہو کہ ترتیب تنظیم سے پیدا ہوتی ہے۔ لیکن نباتات وحیوانات میں جو ترتیب ہمیں ملتی ہے ان کا مشاہدہ کسی تنظیم کے نتیجہ کے طور پر نہیں ہوتا۔

دوسرے اب یہ تسلیم کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے تخلیق کے مقصد کے حصول کے لیے تدریجی ارتقائی مقام کافی نقصان برداشت کرنے کے بعد حاصل کیا ہے۔ ارتقائی عمل زندگی کی بقا کے لیے مسلسل جدوجہد ہے جس میں پیچھے رہ جانے والی کئی انواع مٹ گئیں۔

## 3۔ تیسری وجودی دلیل:

جہاں تک وجود باری تعالیٰ کا تعلق ہے ظاہر ہے کہ فلسفہ اور فلسفیانہ استدلال ہماری اس سمت میں صرف نظری رہنمائی کر سکتے ہیں۔ حتمی اور یقینی طور پر خدا کے وجود کے بارے میں علم صرف وحی کی روشنی یا مذہبی تجربے کی بنیاد پر حاصل کیا جا سکتا ہے۔ کانٹ کا یہ استدلال کہ صرف ایک قادر ورحیم خدا کی موجودگی میں مکافات عمل کا امکان ہوسکتا ہے۔ اپنی جگہ بڑا وزنی اور وقیع ہے۔ خدا کا وجود اس اعتبار سے عقل عملی کا تقاضا ہے اور وہ چاہتی ہے کہ اس کو ضرور پورا ہونا چاہیے۔

اِس پر تنقید کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یہ دلیل وہ منطقی مغالطہ ہے جسے اصطلاح میں مصادرہ قلوب کہا جاتا ہے۔ اِس میں ہم اس دعوی کو جسے ثابت کرنا مقصود ہوتا ہے پہلے ہی سے ثابت شدہ تسلیم کر لینے اور یوں منطقی کو حقیقی کا مترادف ٹھہراتے ہیں۔

ہم نے دیکھا کہ علامہ اقبال خدا کے وجود کی تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے حکمائے مغرب کی اِنہی تین دلیلوں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ کونی (علّی)، غائی اور وجودی۔ یہ اولہ تلاثہ اگرچہ اس امر کا ثبوت ہیں کہ فکر انسانی نے جب کبھی ذات مطلق (واجب الوجود) کی جستجو کی تو چار و ناچار انہی تین راستوں پر گامزن ہونا پڑا، لیکن منطقی اعتبار سے دیکھا جائے تو ان میں کوئی دلیل بھی ذات مطلق کے اثبات پر دلالت نہیں کرتی۔ برعکس اس کے ان پر شدید اعتراضات وارد ہوتے ہیں اور ہمیں کہنا پڑتا ہے کہ ان دلائل سے حکمائے مغرب کے نظریات اور ان پر انہی کی تنقید کی روشنی میں وہ خود اعتراف کر رہے ہیں کہ وہ خدا کے وجود کو ثابت کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

## قرآن کا اللہ کی ماہیت کے بارے میں مؤقف:

قرآن کی رو سے خدا کا ذاتی نام اللہ ہے، جو ''ال'' اور ''اِلٰہ'' کا مرکب ہے۔ یعنی وہ ''اِلٰہِ'' واحد جس کا تصور قرآن پیش کرتا ہے اور جس کی صفات اس شرح وبسط سے اس میں بیان ہوئی ہیں۔ اللہ کیا ہے؟ اس کی ہستی کیسی ہے؟ اس کی ذات کی کنہ

وحقیقت کیا ہے، وہ کہاں سے آ گیا یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب عقل انسانی کے احاطہ سے باہر ہے۔ عقل درحقیقت نام ہے ان مجموعی نتائج کا جو انسان اپنے علم ومشاہدات سے حاصل کرتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ وہ ذرائع جن سے انسان علم حاصل کرتا ہے، محدود ہیں۔ سو جب وہ ذرائع محدود ہیں تو ان ذرائع کا ماحصل بھی محدود ہی ہوگا اور محدود، لامحدود کا ادراک کس طرح کرسکتا ہے؟ وہ انسان جو ابھی تک یہ بھی معلوم نہیں کرسکا کہ وہ خود کیا ہے، وہ کیا معلوم کرسکے گا کہ خدا کیا ہے؟ وہ شخص جو مشینری کی حقیقت تک پہنچنے سے عاجز ہے، مشینری بنانے والے کی کنہ وحقیقت کا کس طرح احاطہ کرسکتا ہے؟ ذات خداوندی کی ماہیت کا علم، انسان کی سرحد ادراک سے ماوراء ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم عرفان (خدا کے پہچاننے) کا تقاضا نہیں کرتا۔ جس چیز کو انسان براہ راست نہ سمجھ سکے اس کے متعلق اندازہ لگانے کا دوسرا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ اس جیسی کسی دوسری شے پر غور کیا جائے لیکن وہ ذات بے مثل وبے نظیر ہے۔

لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ ۚ (42:11)

''اس کی مثل کوئی شے نہیں۔''

لہٰذا خدا کی ماہیت انسان کے ذہن میں کیسے آسکتی ہے؟

محسوسات کا خوگر انسان ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ بسیط سے بسیط حقیقت بھی لباس مجاز میں اس کے سامنے جلوہ بار ہوں یا کم ازکم اس حقیقت مجردہ کو بیان اس انداز سے کیا جائے کہ وہ اس کے ذہن میں ایک محسوس پیکر کا تصور قائم کرسکے۔ یہی وہ بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے انسان نے بت پرستی اختیار کی۔ اسلام چونکہ علم وبصیرت کا دین ہے، اس لیے اس نے وہ تمام دروازے بند کردیے جن کے راستے اس قسم کی توہم پرستی ذہن انسانی میں داخل ہوسکتی تھی۔ اس نے ذات باری تعالیٰ کے متعلق کوئی مثال بھی ایسی بیان نہیں کی جس سے ذہن کسی محسوس ومشہود پیکر کی طرف منتقل ہوجائے۔ وہ حقیقت کو حقیقت رکھنا چاہتا ہے۔ ذہن انسانی کا تقاضا پورا کرنے کے لیے اسے کسی مجسمہ میں تبدیل نہیں کرنا چاہتا۔

قدیم نظریہ ارتقاء کے مطالعہ میں ہم نے دیکھا کہ لوگ خدا کو متعدد دیوی دیوتاؤں کو خیالی انسانی مجسم ومُثبت ومنفی صِفات کی شکل میں پیش کرتے تھے۔ ہمارے ہاں کے فرقۂ معتزلہ نے اللہ الواحد کی صِفات میں دیوی دیوتاؤں کو ہی نہیں نکالا، بلکہ اللہ میں انسانوں جیسی صِفات رکھنے کی بھی نفی کردی۔ اِس ضِمن میں امام الحسن نے اپنی کتاب مقالاتِ الاسلامین میں مُعتزلہ کے مؤقف کی وضاحت میں فرمایا کہ:

1۔ خدا ایک ہی منفرد ہے۔

2۔ وہ الظاہر والباطن اور الاوّل والمتقدم ہے۔ مخلوقات سے قبل موجود ہے۔

3۔ وہ عالم ہے۔ قادر ہے اور زندہ ہے۔

4۔اُس نے جو چاہا پیدا کر دیا۔اُس نے کوئی چیز مثال دیکھ کر پیدا نہیں کی۔

5۔وہ جسم رکھتا ہے نہ کالبد۔نہ اس کا جُثہ ہے نہ صورت۔خون بھی نہیں گوشت بھی نہیں۔

6۔وہ نہ جوہر ہے نہ عرض

7۔نہ اس کا ذائقہ ہے اور وہ خوشبو بھی نہیں رکھتا ہے۔

8۔اسے چھوا بھی نہیں جا سکتا۔

9۔نہ اس میں حرارت ہے نہ رطوبت۔

10۔وہ طول بھی نہیں عرض بھی نہیں اور عمل بھی نہیں۔

11۔نہ اس میں اجتماع ہے نہ افتراق۔نہ متحرک ہے نہ ساکن۔

12۔نہ اس کے الگ اجزاء ہیں اور وہ جوارح واعضاء بھی نہیں رکھتا۔

13۔وہ ذی جہات بھی نہیں نہ اس کا کوئی دایاں ہے نہ بایاں۔نہ آگا ہے نہ پیچھا۔

14۔وہ اوپر بھی نہیں نیچے بھی نہیں۔

15۔کوئی مکان اس کا احاطہ نہیں کر سکتا اور زمانہ اس پر حاوی نہیں ہو سکتا۔

16۔وہ جدا بھی نہیں اور مِلا ہوا بھی نہیں۔

17۔وہ کسی ایسے وصف سے متصف نہیں کیا جا سکتا جو خلق میں پائے جاتے ہوں اور حادث وفانی ہوں۔

18۔نہ اس کے بارے میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ متناہی ہے۔

19۔اسے ناپا بھی نہیں جا سکتا۔

20۔وہ مُختلف جہات میں سمایا ہوا نہیں۔

21۔وہ محدود بھی نہیں۔

22۔نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا۔

23۔تقدیریں اس کا احاطہ نہیں کر سکتیں اور پردے اسے مستور نہیں کرتے۔

24۔وہ حواس کے ادراک سے بالا ہے۔

25۔اسے لوگوں پر قیاس نہیں کیا جا سکتا اور مخلوقات سے کسی طرح مماثلت نہیں رکھتا اس لئے کہ

26۔نہ اس پر آفات کا نزول ہو سکتا ہے اور نہ مصیبتیں اسے گھیر سکتی ہیں۔

27۔ہر وہ تصور جو وہم میں آ سکتا ہے اور ہر وہ بات جو تصور میں آ سکتی ہے،اس کی مشابہت سے ماوراء ہے۔

28۔نہ اُسے آنکھ دیکھ سکتی ہے۔نہ بینائی اُس کا ادراک کرسکتی ہے۔

29۔اذہان اس کا احاطہ نہیں کرسکتے اور سماعت اسے سُن نہیں سکتی۔

30۔وہ دوسری مخلوقات کی طرح عالم، قادر اور زندہ نہیں۔

31۔نہ وہ عُلماء کی طرح ہے۔

32۔صرف وہی قدیم ہے اور کوئی قدیم نہ ہے۔

33۔صرف وہی معبود ہے اور اُس کے علاوہ کوئی معبود نہیں ہے۔

34۔نہ کوئی اس کے اقتدار میں شریک ہے اور نہ اس کا کوئی وزیر مختار ہے۔اس کی مرضی وتکوین میں کوئی اس کا معین و مددگار نہیں۔

35۔نہ اسے کوئی نفع پہنچ سکتا ہے نہ نقصان۔

36۔سرور ولذات سے وہ بیگانہ ہے اور اذیت والم سے نا آشنا ہے

37۔نہ وہ ذی غایت ہے کہ اس کی انتہا ہو۔

38۔اس پر فنا بھی طاری نہیں ہوسکتی۔

39۔نہ اس میں کسی قسم کی کوتاہی یا کمی ہے اور نہ مجبوری اور بے چارگی

40۔نہ اُس کی کوئی بیوی ہے نہ اولاد

معتزلہ نے جہاں انسان سے مشبہ صفات ذکر قرآن میں آیا ہے، اُن کی تاویل اُنہوں نے یہ کی ہے کہ یہ ذاتِ باری تعالٰی کے اسماء/صِفات ہیں، لہٰذا اِن کا تعلق انسانی جسم سے مُطلق نہیں بنتا۔ذاتِ خداوندی کی ماہیئت کا علم، انسان کی سرحد ادارک اور عرفان سے ماورا ہے، اِسی لئے اللہ کی ذات کو۔نہیں، بلکہ صِفاتِ خداوندی کو معیار قرار دیا جاتا ہے۔ذاتِ خداوندی کی ماہیئت کا علم، انسان کی سرحد ادارک سے ماورا ہے۔

اللہ کے وجود کے ساتھ کائنات کی تخلیق کے پارے میں خدا کو ماننے والے، ظاہر پرستوں، سے پوچھتے ہیں کہ تم کہتے ہو کہ کائنات از خود وجود میں آگئی ہے، تو بتاؤ کائنات از خود کیسے وجود میں آگئی ہے؟ اس کا تو ضرور کوئی خالق ہوگا، جس نے کائنات کو پیدا کیا ہے۔اس دلیل سے خدا کو ماننے والے سمجھتے ہیں کہ ہم خالق تک پہنچ گئے ہیں۔اس کے بعد دوسری طرف سے اعتراض آتا ہے کہ جب تم خود مانتے ہو کہ بغیر خالق کے کوئی شے وجود میں نہیں آسکتی تو پھر جسے تم خالق کہتے ہو، جسے تم خدا کہتے ہو، وہ پھر بغیر خالق کے کیسے وجود میں آگیا؟۔اِس سبب کو ڈھونڈنے کی تلاش میں تدریجی مراحل طے کرتے ہوئے وہ اللہ کے دئے ہوئے نظریہ ارتقاء ہی سے اِس کا حل ڈھونڈتا ہے۔

ڈاکٹر شاکر حسین خان
(شعبہ علوم اسلامی، جامعہ کراچی)

# معاملات میں شہادت کی اہمیت قرآن مجید کی روشنی میں

## (ایک خصوصی مطالعہ)

اسلام میں شہادت یعنی گواہی دینے کو ایک خاص اہمیت اور فضیلت کا کام بتایا ہے اور انسانوں کو سچی گواہی دینے کا حکم دیا گیا ہے۔

### لفظ ''شھد'' قرآن مجید میں:

قرآن کریم میں لفظ شہید پندرہ (15) مرتبہ، شہیداً بیس (20) مرتبہ شھداء، اٹھارہ (18) مرتبہ اور لفظ شہادۃ بیس (20) مرتبہ وارد ہوا ہے۔[1]

### معنی ومفہوم:

شہید کا مادہ ش۔ ہ۔ د، ہے اور شَھِدَ یَشْھَدُ سے متعدد معانی میں استعمال ہوا ہے اس کے ایک معنی حاضر ہونے/موجود ہونے کے ہیں۔ اس لیے شہادۃ ایسی حقیقت کو کہتے ہیں جو بصیرت کی بنا پر بلاکم وکاست بیان یا حاضر کردی جائے۔[2]

اور ایسا کرنے والے کو شاہد یا شہید کہا جاتا ہے۔ پھر اسی مادہ سے مشاہدہ کا لفظ بنا ہے جس کے معنیٰ آنکھوں سے دیکھنے کے آتے ہیں اور اس معنی پر اگر مفہوم کا اضافہ کرلیا جائے تو یہ لفظ کسی بھی چیز، حقیقت یا واقعہ کا (آنکھوں کے ساتھ ساتھ) دیگر حواس کی گرفت میں آجانا، معنیٰ کے توسع پر دلیل بھی بن سکتا ہے پھر یہ بھی واضح رہے کہ قرآن مجید میں شہادۃ کا لفظ غیب کے مقابلے میں بولا گیا ہے۔[3]

مندرجہ بالا معانی کے علاوہ علامہ پرویزؒ کے نزدیک: ''شہید کے معنی کسی کے ساتھ موقع پر موجود ہونا ہے''[4]

جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد فرمایا گیا: وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا (4:72) ''اور تم میں سے کوئی ایسا بھی ہے جو دیر کرتا ہے پھر اگر تم پر کوئی مصیبت آجائے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھ پر مہربانی کی کہ میں ان میں موجود نہیں تھا۔''

---

(1) المعجم المفہرس لالفاظ القران الکریم، (2) المفرادات، امام راغب الاصفہانی، (3) تفسیر مسائل والاحکام، ڈاکٹر محمد شکیل اوج/ مرتبہ ڈاکٹر شاکر حسین خان، مجلس التفسیر، کراچی، ستمبر 2015ء، ص: 79-80 (4) پرویز، تبویب القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، 2015ء، ص: 690

مزید معانی: نگران (2:143)، راہنما (2:23) اور تعلیم خداوندی (2:140)۔[1]

ہمارے ہاں مقتولین کے لیے شہید/ شہادت کی اصطلاح مستعمل ہے وہ شہادت کے قرآنی مفہوم سے لگا نہیں کھاتی حالانکہ قرآن مجید نے اُن کے لیے ''احیاء'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ آیات قرآنی ملاحظہ کیجئے: وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ (2:154) اور نہ کہو انہیں جو قتل کئے جائیں اللہ کے راستے میں، مردہ ہیں بلکہ وہ حیات ہیں اور لیکن تمہیں شعور نہیں (ان کی زندگی کے بارے میں) اور ارشاد ہوا: وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ﴿۱۶۹﴾ (3:169) اور نہ مت گمان کرو ان کی نسبت جو اللہ کی راہ میں قتل کیے جائیں کہ وہ مردہ ہیں بلکہ وہ حیات ہیں ربِ کریم کے نزدیک، رزق دیئے جاتے ہیں۔

## شہادت کے متعلق آیات قرآنی:

اللہ رب العلمین، ملائکہ اور اہل علم شہادت دیتے ہیں جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا بِالْقِسْطِ ؕ (3:18)

اللہ اس بات کی گواہی دیتا ہے کہ اس کے سوا کوئی الٰہ نہیں اور ملائکہ اور اہل علم جو انصاف پر قائم ہیں۔

اللہ رب العلمین نے اپنے عباد کی صفات بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ ۙ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا (25:72) اور وہ نہیں دیتے جھوٹی گواہی۔

آیت مذکورہ سے ثابت ہوتا ہے کہ عباد الرحمٰن ہمیشہ سچ بولتے ہیں۔ اس لیے اپنی صفت اور فطرت کی وجہ سے وہ گواہی دیتے وقت بھی جھوٹ سے بچے رہتے ہیں۔

مؤمن ہمیشہ اپنی شہادت پر قائم رہتے ہیں جیسا کہ ارشاد فرمایا گیا: وَالَّذِيْنَ هُمْ بِشَهٰدٰتِهِمْ قَآئِمُوْنَ ﴿۳۳﴾ (70:33) ''اور جو اپنی شہادتوں پر قائم رہتے ہیں۔''

اللہ رب العلمین نے اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا (4:135) ''اے لوگو جو مان گئے! تم انصاف پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہنے والے اور اللہ کے لیے گواہی دینے والے بن جاؤ۔ اگرچہ گواہی خود تمہارے خلاف ہو یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں کے خلاف اگرچہ وہ غنی ہوں یا محتاج۔''

اللہ رب العلمین نے مذکورہ آیت میں اہل ایمان کو مخاطب کر کے گواہی دینے کا حکم ارشاد فرمایا۔ اس میں مرد و عورت کی تفریق نہیں یعنی تمام اہل ایمان خواہ مرد ہوں یا عورتیں، سب کو گواہی دینی چاہیے اُس وقت جب ان کی ضرورت ہو۔ یہی حکم اللہ رب العلمین نے سورۃ المائدہ میں بھی ارشاد فرمایا:

(1) پرویز تبویب القرآن، ص:690

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ ۡ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ (5:8) ''اے لوگو جو مان گئے ہو اللہ کے لیے انصاف کی گواہی دینے کے لیے تیار ہو جایا کرو۔ اور لوگوں کی دشمنی تم کو اس بات پر آمادہ نہ کر دے کہ انصاف چھوڑ دو۔ انصاف کیا کرو کہ یہی تقویٰ کی بات ہے اور خدا کا تقویٰ اختیار کرو، کچھ شک نہیں کہ خدا تمہارے سب اعمال کی خبر رکھتا ہے۔''

آیات قرآنیہ سے ثابت ہوا کہ اسلام میں شہادت کی بڑی اہمیت ہے، سچی گواہی دینا مؤمنین کا شعار، خصلت، ذمہ داری اور عباد الرحمٰن کی صفت ہے اللہ رب العٰلمین نے اہل ایمان کو تاکید کی ہے کہ ہمیشہ سچ کا ساتھ دیں اور گواہی دینے کے لیے تیار رہیں۔

## نصاب شہادت:

اللہ رب العٰلمین نے مختلف معاملات میں شہادت کے لیے قرآن مجید میں جو نصاب مقرر فرمایا ہے اُس کی تفصیل درج ذیل ہے:

### 1۔ قذف کی گواہی کا نصاب:

قذف (پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگانا) میں چار گواہ مقرر کیے گئے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی پاک دامن عورت پر زنا کی تہمت لگاتا ہے تو اس کے لیے لازم ہے کہ وہ اس کے چار گواہ پیش کرے ورنہ اس کے اسی درے لگائے جائیں گے اور ان کی کبھی بھی گواہی قبول نہیں کی جائے گی۔ جیسا کہ ارشاد فرمایا: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَآءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَّلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۙ (24:4) ''اور جو لوگ شادی شدہ عورتوں (محصنات) پر بدکاری کا الزام لگائیں اور معائینے کے لیے چار گواہ پیش نہ کریں تو ان کے اسی درے لگاؤ اور ان کی گواہی قبول نہ کرو، وہی لوگ فاسق ہیں۔''

### 2۔ لعان کی گواہی کا نصاب:

جو شخص اپنی بیوی پر بدکاری کی تہمت لگائے اور اس کے چار گواہ نہ ہوں تو اس صورت میں عورت پر سے زنا کی سزا ختم ہو جاتی ہے۔ اس کو لعان کہتے ہیں۔ لعان کے حوالے سے ارشاد ہوا: وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ اَزْوَاجَهُمْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهُمْ شُهَدَآءُ اِلَّآ اَنْفُسُهُمْ فَشَهَادَةُ اَحَدِهِمْ اَرْبَعُ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةُ اَنَّ لَعْنَتَ اللّٰهِ عَلَيْهِ اِنْ كَانَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَيَدْرَؤُا عَنْهَا الْعَذَابَ اَنْ تَشْهَدَ اَرْبَعَ شَهٰدٰتٍۭ بِاللّٰهِ ۙ اِنَّهٗ لَمِنَ الْكٰذِبِيْنَ ۝ وَالْخَامِسَةَ اَنَّ غَضَبَ اللّٰهِ عَلَيْهَآ اِنْ كَانَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ (24:6-9) ''اور جو لوگ اپنی بیویوں پر بدکاری کی تہمت لگائیں اور نہ ہوں ان کے پاس گواہ سوائے اُن کے، تو ہر اک کی شہادت یہ ہے کہ پہلے تو چار مرتبہ گواہی دے اللہ کی قسم کھا کر بیشک وہ سچا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ اللہ کی لعنت ہو اگر وہ جھوٹا ہے، اور عورت سے سزا اس بنا پر ٹل سکتی ہے کہ وہ چار مرتبہ گواہی

دے اللہ کی قسم کھا کر، بیشک یہ جھوٹا ہے، اور پانچویں بار یہ کہے کہ اللہ کا غضب ہو مجھ پر اگر یہ سچا ہے۔''

## 3۔ ہم جنس پرستی/سحاقت کی گواہی کا نصاب:

ہم جنس پرستی/سحاقت میں بھی چار گواہ مقرر کئے گئے ہیں۔ اللہ رب العلمین کا ارشاد ہے: وَالّٰتِیۡ یَاۡتِیۡنَ الۡفَاحِشَۃَ مِنۡ نِّسَآئِکُمۡ فَاسۡتَشۡہِدُوۡا عَلَیۡہِنَّ اَرۡبَعَۃً مِّنۡکُمۡ ۚ فَاِنۡ شَہِدُوۡا فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ فِی الۡبُیُوۡتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىہُنَّ الۡمَوۡتُ اَوۡ یَجۡعَلَ اللّٰہُ لَہُنَّ سَبِیۡلًا ﴿۱۵﴾ (4:15) ''اور جو تمہاری دو عورتیں آپس میں فحش کام کریں تو ان پر چار گواہ مقرر کرلو۔ اور اگر وہ (چاروں) گواہی دیں تو ان (دونوں عورتوں) کو گھروں میں ٹھہرائے رکھو۔ یہاں تک کہ بذریعہ موت اٹھالی جائیں یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے۔''

## 4۔ وصیت کی گواہی کا نصاب:

قرآن مجید نے وصیت کی گواہی کے لیے دو گواہ مقرر کیے ہیں جیسا کہ فرمایا گیا:

یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا شَہَادَۃُ بَیۡنِکُمۡ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الۡمَوۡتُ حِیۡنَ الۡوَصِیَّۃِ اثۡنٰنِ ذَوَا عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ اَوۡ اٰخَرٰنِ مِنۡ غَیۡرِکُمۡ اِنۡ اَنۡتُمۡ ضَرَبۡتُمۡ فِی الۡاَرۡضِ فَاَصَابَتۡکُمۡ مُّصِیۡبَۃُ الۡمَوۡتِ ؕ تَحۡبِسُوۡنَہُمَا مِنۡۢ بَعۡدِ الصَّلٰوۃِ فَیُقۡسِمٰنِ بِاللّٰہِ اِنِ ارۡتَبۡتُمۡ لَا نَشۡتَرِیۡ بِہٖ ثَمَنًا وَّلَوۡ کَانَ ذَا قُرۡبٰی ۙ وَلَا نَکۡتُمُ شَہَادَۃَ اللّٰہِ اِنَّاۤ اِذًا لَّمِنَ الۡاٰثِمِیۡنَ ﴿۱۰۶﴾ (5:106) اے ماننے والو! شہادت یہ ہے تم میں سے دو عادلوں کی تمہارے درمیان وصیت کے لیے تم میں سے کوئی جب اس کے موت کا وقت آجائے۔ یا دوسرا یہ کہ تم سفر میں ہو تو کسی غیر کو بنالو، تم پر موت کی مصیبت آجائے تو، اگر تم کو ان گواہوں کی جانب شک ہو تو صلوٰۃ کے بعد ان دونوں کو کھڑا کرو، اللہ کی قسم کھائیں کہ نہ ہم کوئی معاوضہ لیں گے۔ چاہے کوئی ہمارا رشتے دار کیوں نہ ہو ہم اللہ کی شہادت کو نہیں چھپائیں گے اگر ایسا کریں تو ہم دونوں کو اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے۔

## 5۔ طلاق اور بعدِ طلاق رجوع میں گواہی کا نصاب:

طلاق دیتے وقت اور طلاق دینے کے بعد رجوع کرتے وقت قرآن مجید نے دو گواہ مقرر کیے ہیں ارشاد ہوا: فَاِذَا بَلَغۡنَ اَجَلَہُنَّ فَاَمۡسِکُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ اَوۡ فَارِقُوۡہُنَّ بِمَعۡرُوۡفٍ وَّاَشۡہِدُوۡا ذَوَیۡ عَدۡلٍ مِّنۡکُمۡ وَاَقِیۡمُوا الشَّہَادَۃَ لِلّٰہِ ؕ ذٰلِکُمۡ یُوۡعَظُ بِہٖ مَنۡ کَانَ یُؤۡمِنُ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یَجۡعَلۡ لَّہٗ مَخۡرَجًا ۙ﴿۲﴾ (65:2) ''پھر جب وہ اپنی عدت پوری کرلیں تو انہیں اچھائی سے رکھ لو یا اچھائی سے رخصت کردو اور دو عادل گواہ کرلو اپنوں میں سے، اور قائم کرنا اللہ کے لیے شہادت، ان باتوں کی انہیں نصیحت کی جاتی ہے جو مانتے ہیں اللہ کو اور آخرت کے دن کو، اور جو کوئی اللہ سے ڈرے گا تو وہ اس کے لیے پیدا کردے گا اخلاص کی صورت۔

عصر حاضر میں پاکستانی مؤمنین (سُنّی) عمومی طور پر طلاق دیتے وقت گواہوں کا اہتمام نہیں کرتے انہیں اس حکمِ قرآنی پر توجہ دینی چاہیے۔

## 6۔ یتیموں کے اموال واپس کرتے وقت گواہی کا نصاب:

یتیموں کو ان کے اموال واپس کرتے وقت گواہ بنانے کا حکم ہے لیکن نصاب/تعداد معین نہیں کی گئی جیسا کہ ارشاد ہوا:

وَابْتَلُوا الْيَتٰمٰى حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ ۚ فَاِنْ اٰنَسْتُمْ مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوْٓا اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ ۚ وَلَا تَاْكُلُوْهَآ اِسْرَافًا وَّبِدَارًا اَنْ يَّكْبَرُوْا ۭ وَمَنْ كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۚ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ فَاِذَا دَفَعْتُمْ اِلَيْهِمْ اَمْوَالَهُمْ فَاَشْهِدُوْا عَلَيْهِمْ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ حَسِيْبًا (4:6) ''اور آزماتے رہو یتیموں کو یہاں تک کہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں، پھر اگر ان میں عقل کی پختگی دیکھو تو ان کا مال ان کے حوالے کردو، اور اس وجہ سے کہ وہ بڑے ہو جائیں اس کو فضول خرچی اور جلد بازی میں نہ اڑاؤ، جو شخص آسودہ ہو اسے بچنا چاہیے اور جو فقیر ہو وہ مناسب طور پر کچھ لے لے اور جب ان کا مال ان کے حوالے کرنے لگو تو گواہ کرلو اور اللہ کافی ہے حساب لینے والا۔''

## 7۔ معاملہ دَین (میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ) میں گواہی کا نصاب:

معاملہ دَین میں دو مرد گواہ رکھنے کا حکم موجود ہے اگر دو مرد نہ ہوں ایک مرد ہو تو تو اس کے ساتھ دو عورتوں کو گواہ بنانے کا حکم ہے یعنی دو عورتوں کی گواہی ایک مرد کے ساتھ رکھی گئی ہے آیت قرآنی ملاحظہ کیجیے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ۭ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۠ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـــًٔا ۭ فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ۭ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ۭ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا ۭ وَلَا تَسْــَٔـــُٔوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ۭ ذٰلِكُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا (2:282) ''اے ماننے والو! جب تم کسی میعاد معین کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اس کو لکھ لیا کرو اور لکھنے والا تم میں سے کسی کا نقصان نہ کرے بلکہ انصاف سے لکھے، لکھنے والا انکار بھی نہ کرے جسے اللہ نے لکھنا سکھایا۔ اور دستاویز لکھ دے۔ اور جو شخص قرض لے وہی بول کر لکھوائے۔ اور اس کا مالک اللہ سے خوف کرے اور زرِ قرض سے کچھ کم نہ لکھوائے۔ اور اگر قرض لینے والا کم عقل یا ضعیف ہو یا مضمون لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا دوست وہ انصاف کے ساتھ مضمون لکھوائے۔ اور اپنوں میں سے دو مرد گواہ کرلو۔ اور اگر دو مرد میسر نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جنہیں تم گواہی کے لیے موزوں سمجھو کرلو، تاکہ اگر ایک بھول جائے (گھر کی ذمہ داریوں کے بوجھ کے باعث) تو دوسری اُسے یاد دلا دے، اور جب گواہ، گواہی کے لیے طلب کئے جائیں تو انکار نہ کریں۔ اور قرض کم ہو یا زیادہ اس کے لکھنے میں سُستی نہ برتو، یہ بات اللہ کے نزدیک نہایت قرین انصاف ہے۔ اور شہادت کے لیے بھی درست طریقہ ہے۔ اس سے تمہیں کسی قسم کا شبہ پیدا نہ ہوگا۔''

مذکورہ آیت سے ثابت ہورہا ہے کہ اُس صورت میں جب دو مرد میسر نہ ہوں تو دو عورتوں کو گواہی کے طور پر شامل کرنے کی رعایت ہے۔ باقی معاملات میں قرآن نے یہ اصول لاگو نہیں کیا یعنی یہ نہ سمجھا جائے کہ ایک عورت کی گواہی آدھی ہے۔ بعض معاملات ایسے ہیں جس میں صرف عورت ہی کی گواہی قبول کی جاتی ہے۔ مثلاً بچہ کس کا ہے؟ بچہ کس عورت نے جنا؟ بچے کا باپ کون ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ کہنا کہ عورت ناقص العقل ہے اس لیے اس کی گواہی آدھی رکھی گئی ہے درست معلوم نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے ایسی کوئی بات بیان نہیں کی جس سے عورت کی تذلیل ہوتی ہو۔ یہ سب گھڑی ہوئی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ جس کا حقیقت، اسلام اور قرآن سے کوئی تعلق نہیں بنتا۔

پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج آیتِ مذکورہ (2:282) کے تحت رقم طراز ہیں ''پورے قرآن میں فقط یہی ایک مقام ہے جہاں عورتوں کی گواہی کو اس طرح بیان کیا گیا ہے۔ بقیہ مقامات پر اس طرح کی کسی قید یا شرط کے بغیر گواہوں کا تذکرہ ملتا ہے صیغہ چونکہ ہر جگہ مذکر کا استعمال ہوا ہے جس سے یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ وہاں فقط مرد گواہوں کا بیان ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن کے بیشتر احکامات مذکر کے صیغے میں استعمال ہوئے ہیں اور عورتیں اس کی مخاطب سمجھی جاتی ہیں۔ اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ سورۃ البقرہ کی آیت کے سوا، جہاں بھی گواہوں کا تذکرہ ملتا ہے وہ بغیر کسی صنفی اختلاف کے مرد و عورت، ہر دو کے بیان پر مشتمل ہے۔ اسے صرف مردوں سے مخصوص کرنا، بلاشبہ عورتوں کے ساتھ زیادتی ہے۔ بجز معاملہ قرض کے، جہاں فقط ایک عورت کی گواہی کو قبول نہ کرنا ہی دراصل قرآن حکیم کی دائمی و ابدی سچائی کا بہت بڑا ثبوت ہے۔''(1)

## 8۔ بیع و شریٰ کے وقت گواہی کا نصاب:

بیع و شریٰ کے وقت گواہ بنانے کا حکم موجود ہے لیکن اس میں بھی گواہوں کی تعداد متعین نہیں کی گئی جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا: اِلَّآ اَنۡ تَكُوۡنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيۡرُوۡنَهَا بَيۡنَكُمۡ فَلَيۡسَ عَلَيۡكُمۡ جُنَاحٌ اَلَّا تَكۡتُبُوۡهَا ؕ وَاَشۡهِدُوۡۤا اِذَا تَبَايَعۡتُمۡ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا شَهِيۡدٌ ؕ وَاِنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاِنَّهٗ فُسُوۡقٌۢ بِكُمۡ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَىۡءٍ عَلِيۡمٌ ﴿۲۸۲﴾ (2:282) ''اگر سودا دست بدست ہو جو تم آپس میں طے کرتے ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں، اور جب خرید و فروخت کرو تو بھی گواہ کر لیا کرو اور کاتب دستاویز اور گواہ کسی طرح کا نقصان نہ کریں۔ اگر تم ایسا کرو گے تمہارے لیے گناہ کی بات ہے، اور اللہ سے ڈرو اور وہ تمہیں کیسی باتیں سکھاتا ہے۔ اور اللہ ہر شے سے باخبر ہے۔''

لیکن! اگر ہم آیت کے پہلے جز کو دیکھیں تو حاصل ہوگا کہ معاملہ دَین، کی طرح بیع و شریٰ کے وقت دو گواہ ہونے چاہیے۔

## کسی قوم کے خلاف خبر لانے والے کے متعلق حکم:

قرآن مجید میں ارشاد ہوا: يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًا ۢ بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ ﴿۶﴾ (49:6) ''اے لوگو جو مان گئے ہو اگر کوئی فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لائے (کسی

(1) اوج، محمد شکیل، ڈاکٹر، نسائیات، فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ کراچی، کراچی، جون 2012ء، ص:229

کے خلاف) تو تحقیق کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ تم لاعلمی میں کسی گروہ کو نقصان پہنچادو اور بعد میں تمہیں اپنے اس فعل پر ندامت اٹھانی پڑے۔''

آیت مذکورہ سے ثابت ہوا کہ ایک فاسق آدمی کی گواہی بلاتحقیق قبول نہیں کی جاسکتی البتہ اگر کوئی ایک مردِ صالح کسی قوم کے متعلق خبر لائے تو اس کی خبر کو قبول کیا جاسکتا ہے۔

جیسا کہ پروفیسر ڈاکٹر حافظ محمد شکیل اوج رقم طراز ہیں ''فقہ حنفی میں رمضان کے چاند کے سلسلے میں ایک عادل شخص کی گواہی بھی قابل قبول ہے۔ خواہ مرد ہو یا عورت نیز برائے ولادت و بکارت اور عیوبِ نساء جن پر مردوں کو آگہی نہیں ہوتی، ان کے لیے بھی حنفیوں اور حنبلیوں کے نزدیک دو عورتیں ہوں تو بہتر ورنہ ایک آزاد مسلمان عورت کی گواہی بھی کافی ہے۔''(1)

## قرائنی شہادت:

قرآئن جمع ہے، قرینہ کی۔ قَرِینَہ (ع، صف) کے معنی، ڈھنگ، صورت، طرز، روش، طور طریق، مناسبت، سلیقہ، سجاوٹ، ترتیب، قیاس، قیانہ، انداز۔(2)

عربی میں کہتے ہیں ''قَرَنَ الفَرَسُ'' گھوڑے کا پچھلے قدم کو اگلے قدموں پر رکھ کر دوڑنا۔(3)

قانونی اصطلاح میں قرائنی شہادت (evidenceCircumstantial) ایسی شہادت جو عینی گواہوں کی فراہم کردہ نہ ہو بلکہ ایسے واقعہ یا واقعات متعلقہ پر مبنی ہو جس سے مبینہ امر واقعہ صحت کے سوا کوئی اور نتیجہ نہ نکالا جاسکتا ہو۔(4)

## قرائنی شہادت کی قرآنی اہمیت:

اسلامی قانون میں شہادتوں کی بڑی اہمیت ہے جب کوئی گواہ میسر نہ آئے تو قرائنی شہادتوں کو پرکھا جاتا ہے۔ اگرچہ سورۃ یوسف میں تین مختلف نوعیت کے معاملات میں یوسف علیہ السلام کی قمیض کا ذکر ہوا ہے لیکن دوسرا معاملہ جو عزیز مصر کی زوجہ کے حوالے سے پیش ہوا ہے اس میں خصوصی طور پر قرائنی شہادت کی اہمیت معلوم ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں بیان ہوا:

قَالَ هِيَ رَاوَدَتْنِي عَنْ نَّفْسِي وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَهُوَ مِنَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٢٦﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِيْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿٢٧﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِيْصَهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَيْدِكُنَّ ۭ اِنَّ كَيْدَكُنَّ عَظِيْمٌ ﴿٢٨﴾ (26-12:28) ''اور گواہی دی ایک گواہ دینے والے نے جو اس عورت کے اہل میں سے تھا، اگر اس (یوسف) کی قمیص آگے سے چاک ہے تو اس عورت نے سچ کہا اور وہ جھوٹوں میں سے ہے۔ اور اگر اس کی قمیض پیچھے سے چاک ہے تو پھر اس نے جھوٹ کہا اور یوسف سچوں میں سے ہے، پس عزیز نے دیکھا ان کی قمیض کو تو وہ پیچھے سے چاک تھی تو فوراً فرمایا یہ سب عورتوں کا فریب ہے، بیشک عورتوں کا فریب بڑا ہوتا ہے۔''

---

(1) اوج، محمد شکیل، ڈاکٹر، نسائیات، فیکلٹی آف اسلامک اسٹڈیز، جامعہ کراچی، کراچی، جون 2012ء، ص: 231، (2) فیروز اللغات اردو جامع، ص 954-955، (3) قاموس الوحید، ص: 1304، (4) قانونی لغت (انگریزی، اردو) خلیل الرحمٰن، چوہدری، ملک لاء بک ایجنسی، کراچی، ص 125

علامہ غلام احمد پرویز آیت مذکورہ کے تحت رقم طراز ہیں ''جرم کے اثبات کے لیے بالعموم عینی شاہدوں کی ضرورت ہوتی ہے لیکن نظام عدل میں ایک اور شہادت کو بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اور وہ شہادت ہے واقعاتی یا احوالی ) Circumstantial (یعنی موقعہ کے احوال وکوائف مشاہدہ اور مطالعہ کرنے کے بعد کسی نتیجہ پر پہنچنا۔ دورِ حاضر میں ان کوائف کے مطالعہ نے سائنٹیفک اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ اس میں طبیعی تحقیق وتفتیش بھی شامل ہے۔ مثلاً مقتول کے خون کا ٹیسٹ، ضرب اور آلہء ضرب کا باہمی تعلق وغیرہ۔ ان شواہد کو بالعموم دورِ حاضر یا دورِ تمدن کی خصوصیات سمجھا جاتا لیکن قرآن کے اس بیان کی رو سے یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ماضی کے اس قدر بعید زمانہ میں بھی واقعاتی شہادت کو اس قدر اہمیت دی جاتی تھی۔ زیر نظر شاہد نے واقعاتی شہادت کی رو سے یہ ثابت کیا ہے کہ مجرم عورت ہے نہ کہ (حضرت) یوسفؑ اگرچہ ذریعہء اثباتِ جرم کو قرآن کریم نے اپنی طرف سے پیش نہیں کیا لیکن جس انداز سے اس نے اس کا ذکر کیا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ اسے اس کی تائید حاصل ہے۔ اگر وہ اس کے حق میں نہ ہوتا تو کہہ دیتا کہ اثباتِ جرم کا طریق قابلِ قبول نہیں قرار پاسکتا۔ بہرحال جرائم کی تفتیش اور فیصلہ کے سلسلہ میں واقعاتی شہادت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔''(1)

حاصل ہوا کہ قرائنی شہادتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے معاملات کو باآسانی حل کیا جاسکتا ہے۔ مجرموں کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔ واردات کے مقام سے کسی آلہ یا ہتھیار کا برآمد ہونا، کسی کے ہاتھ کی انگلیوں اور اس کے جوتوں یا کسی سواری کے نشانات کا پایا جانا مجرم تک پہنچا سکتا ہے۔ کسی شخص پر ظلم کیا گیا ہے تو اس کا طبی معائنہ کرنے سے حقائق معلوم کیئے جاسکتے ہیں۔ کسی خاتون کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی ہو تو اس کے حلیے، لباس، بال، کھال اور زخم کا معائنہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح کسی جہاز، ریل گاڑی، بس، یا عمارت میں لوگ جل جائیں تو ان کا ڈی این اے (D N A) ٹیسٹ کرا کر مردوں کی شناخت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح مقتول کی قبر کشائی کر کے قاتل کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

## طلوعِ اسلام:

کسی انسان کے قتل کے بارے میں جب معاملہ یہاں تک پہنچے کے لوگ ایک دوسرے پر الزام لگانے لگیں اور حقائق چھپادئے جائیں تو قرآنِ کریم نے سورہ البقرہ آیت نمبر 73-72 میں چھپائی گئی باتوں کے اظہار کے لئے تفتیش کا ایک طریق بیان کیا ہے۔ فرمایا، ترجمہ: ''اور جب تم نے ایک نفس کو قتل کر دیا اور تفتیش شروع ہونے لگے ایک دوسرے پر الزام دھرنے لیکن جو کچھ تم چھپا رہے تھے اللہ اس کو ظاہر کرنے والا تھا۔ تو ہم نے کہا کہ جو کچھ یہ چھپا رہے ہیں اس کے اظہار کے لئے میّت کی بعض باتیں (مقامِ قتل کا نقشہ زخم کی نوعیت، آلہ قتل، اس کے سابقہ تعلقات دشمنیاں آخری ملاقاتیں وغیرہ) کا تجزیہ کرو۔ بات نکھر کر باہر آجائے گی۔ اس بارے میں نفسیاتی طریق بھی اپنایا جائے۔ یوں مجرم پکڑا جائے گا اور اللہ اسی طرح سے بظاہر مردہ معاملات کو ظاہر کر دیتا ہے۔ اور قصاص میں قوم کی حیات کا راز پوشیدہ ہے۔

(1) پرویز، مطالب الفرقان، طلوع اسلام ٹرسٹ، جون 1995ء، لاہور، جلد: 7، ص: 25

ڈاکٹر سنبل، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

باب المراسلات

# تین طلاق۔۔۔قرآنی نقطۂ نظر

نیل کے ساحل سے لیکر تا بخاکِ کاشغر لاکھوں مربع میل پر محیط مسلمانوں کا بحر بے کنار آج تباہی و بربادی کا شکار ہے۔ اس نیلگوں آسماں نے اس سے پہلے یہ قومی ذلت و رسوائی نہ دیکھی ہوگی جس سے اُمت مسلمہ لاتعداد افرادی قوّت اور بے پناہ وسائل کے باوجود دوچار ہے۔ ظاہر ہے کہ جس اُمت کو عظمت و رفعت قرآن کی بدولت ملی تھی وہ قرآن کی دوری کی وجہ سے ہی گرفتار بلاء ہے۔ حقیقت بھی یہی ہے۔ قرآن سے دوری کی پہلی اینٹ اسی دن رکھی گئی تھی اور قرآنی معاشرے کے تابوت میں آخری کیل اس وقت ٹھوکی گئی جب عربی زبان کو خارج از دفتر کر دیا گیا اور اس کی جگہ فارسی نے لی۔

اموی بادشاہت (فرعون) نے دینی امور سے جان چھڑانے کی خاطر مذہبی پیشوائیت (ہامان) کو جنم دیا جس نے بادشاہ اور اس کے حواری طبقہ (قارون) کو جواز بخشا اور ان کی تقویت کا باعث بنا۔ فرعون ہامان اور قارون کی اس تکون نے مسلمانوں میں وہی ابلیسی نظام قائم کیا جس کو رسول اللہ ﷺ اور صحابہؓ نے پاش پاش کیا تھا۔ خلافت راشدہ کے درخشندہ دور کے بعد ابلیسی یہ نظام نئی آب و تاب سے قائم ہوا اس فرق کے ساتھ کہ اس بار اس پر قرآنی اصطلاحات کا لیبل لگا کر اسے اسلامی لبادہ پہنا دیا اور اللہ کا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔ عربی زبان سے ناواقف عجمی مسلمان قرآن پڑھنے اور سمجھنے سے قاصر ہوا تو واقدی جیسے داستان گو اور طبری و ابن کثیر جیسے قصہ کار آگے بڑھے۔ انہوں نے من گھڑت روایات و احادیث کے جمع شدہ انبار کو بنیاد بنا کر مسلم تاریخ لکھی اور قرآنِ کریم کے تراجم و تفاسیر تحریر کیں۔ ظلم یہ کیا کہ ان تمام قصے کہانیوں کو جو اسرائیلیات سے مستعار لی گئی تھیں انہیں آنحضرت ﷺ سے منسوب کیا اور قرآن کو بزعمِ خویش اساطیر الاولین بنا دیا۔

ہزار برس میں انسانی علم کہاں سے کہاں پہنچ گیا مگر ہمارے علماء آج بھی انہی تفاسیر کو کاپی کرتے چلے آرہے ہیں اور اس طرح ثواب دارین کما رہے ہیں۔

موجودہ دور کا فرانسیسی قرآنی محقق ''ڈاکٹر مورس بکائے'' جب یہ تفاسیر پڑھتا ہے تو ان میں موجود اغلاط و تضادات پر ایک ضخیم کتاب (Quran, Bible & Science) لکھ دیتا ہے۔

کسی بلند پایہ ادب پارہ کی طرح قرآن میں اللہ تبارک و تعالیٰ نے بنیادی حقائق اور مابعد طبعیات سمجھانے کی غرض سے تشبیہات اور استعارات کو استعمال کیا ہے۔ ان عجمی مترجم و مفسر حضرات نے جان بوجھ کر یا انجانے میں مجازی معنی لینے کی بجائے لغوی معنی لئے اور قرآنِ کریم کو نہ صرف اس کی دلکشی و چاشنی سے محروم کرنے کی کوشش کی بلکہ اس طرح حقیقت خرافات

میں بدل گئی۔ ان حضرات نے قرآن کے ساتھ بالکل وہی سلوک کیا جو ایک دہقان نے علامہؒ کے اس شعر کے ساتھ کیا۔

آ گیا عین لڑائی میں اگر وقتِ نماز قبلہ رو ہو کے زمیں بوس ہوئی قومِ حجاز

کہنے لگا کہ لڑائی کے موقع پر مسلمانوں نے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز شروع کی۔

ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محمود و ایاز

کہ محمود ایک بادشاہ تھا اور ایاز اس کا وزیر۔ وہ دونوں ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے کہ اچانک دشمن نے حملہ کر دیا اور

نہ کوئی بندہ رہا اور نہ کوئی بندہ نواز

انہی قرآنی تراجم و تفاسیر کو پڑھ کر آج کا پڑھا لکھا مسلمان قرآن سے دور اور اسلام سے بددل ہوتا جا رہا ہے۔ حالت یہ ہے کہ جو قاری چند سوال لے کر قرآن کے پاس جاتا ہے تو اسے ان سوالوں کے جواب کیا ملنے ہیں بلکہ مزید سوال کھڑے ہو جاتے ہیں۔

دقیق مسائل کا ذکر ہی کیا۔ قرآن میں جو سادہ مسائل سلیس عربی میں بیان کئے گئے ہیں ان کا سمجھنا بھی کارے دارد۔ آج کی روزمرہ زندگی گوناگوں مشکلات کا شکار ہے۔ جن مسائل سے عموماً افراد معاشرہ دوچار ہوتے ہیں ان میں ایک بڑا مسئلہ طلاق ہے جیسے جیسے ناآسودگی اور بے اطمینانی بڑھتی جا رہی ہے شرح طلاق میں بھی اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ شاید اسی وجہ سے اللہ تبارک وتعالیٰ نے طلاق کے موضوع کو قرآن میں تفصیلاً بیان کیا ہے۔

قرآن کے مطابق طلاق کا لفظ ارادتاً بولا جائے (ایک مرتبہ یا دس مرتبہ) تو پہلی طلاق ہوتی ہے (2:229) خاوند اور بیوی میں علیحدگی لازمی ہے البتہ شوہر اپنی مطلقہ بیوی کو گھر سے نہیں نکال سکتا اور نان ونفقہ بھی اسی کے ذمہ ہے (65:6)، (65:1) طلاق ہوتے ہی عدت شروع ہو جاتی ہے جس کی مدت تین حیض یا تین ماہ ہے يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ۖ (2:228)، حیض نہ آئے (65:4) حقادیت سے پہلے عدت کے دوران صلح کی صورت میں خاوند اپنی بیوی سے بغیر نکاح رجوع کر سکتا ہے وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ (2:228) اگر عدت کی مدت گزر جائے تو طلاق ہو جاتی ہے مگر سابقہ میاں بیوی کو دوبارہ رشتہ قائم کرنے کے لئے نکاح کرنا پڑے گا چاہے عدت گزرے مہینے یا سال گزر جائیں اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے مومنین کو سختی سے ان میاں بیوی کے دوبارہ نکاح کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَن يَنكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ (2:232) ایسی طلاق دو مرتبہ ہو سکتی ہے الطَّلَاقُ مَرَّتَانِ ۖ فَإِمْسَاكٌ بِمَعْرُوفٍ (2:229) یعنی دوبارہ نکاح کے بعد کسی ناچاقی کے بعد پھر طلاق ہو تو یہ دوسری طلاق ہوگی۔ پہلی دو طلاق کو رجعی طلاق بھی کہتے ہیں کیونکہ دونوں دفعہ دوران عدت رجوع کرنے کی اجازت ہے۔ لہٰذا پہلی دو طلاقوں میں کوئی فرق نہیں۔

دوسری طلاق کے کچھ عرصہ بعد اور باہمی رضامندی کے نتیجے میں یہ سابقہ میاں بیوی تیسری دفعہ بھی نکاح کر سکتے ہیں (2:232) لیکن اس کے بعد اگر تیسری طلاق ہو جائے تو دورانِ عدت رجوع بھی نہیں ہو سکتا اور عدت کے بعد نکاح

بھی نہیں ہوسکتا جب تک یہ مطلقہ عورت کسی غیر مرد سے شادی نہ کرے۔ اس کے بعد اگر اس عورت کا دوسرے مرد سے بھی جھگڑا ہوتا ہے اور طلاق ہوجاتی ہے تو پھر یہ پہلے خاوند کے لئے حلال ہوگی۔ فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ (2:230) یاد رہے کہ طلاق سوچ سمجھ کر ارادتاً ہی دی جاسکتی ہے۔ غصے یا نشے کی حالت میں طلاق کے لفظ منہ سے نکالنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی۔ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ (2:225)، (5:89) کیونکہ دلی ارادہ سے کھائی گئی قسمیں ہی اللہ کے نزدیک قابلِ گرفت ہوتی ہیں وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ؕ (2:225)۔

لہٰذا تین طلاقیں اکٹھی نہیں ہوسکتیں۔ یہ غیر قرآنی اور غیر اسلامی ہے۔

اس قدر واضح احکامات کے باوجود ہمارے معاشرے میں آج بھی جو بدقسمت جوڑا یہ غلطی کر بیٹھے۔ ان کی زندگی عذاب بن جاتی ہے کیونکہ نہ انہوں نے قرآن پڑھا ہوتا ہے اور نہ ان پانچ وقت کی نماز کے اماموں نے، جن سے یہ فتویٰ لینے جاتے ہیں۔ مولوی حضرات یہ سننے کے باوجود ''کہ غلطی سے طلاق کا لفظ منہ سے نکل گیا'' طلاق کا فتویٰ لگا دیتے ہیں اور حلالہ تجویز کر کے فوراً خود کو پیش کر دیتے ہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان ہزار سالہ پرانے تراجم وتفاسیر کو ایک طرف رکھا جائے اور عہد حاضر کے قرآنی علوم کے ماہر حضرات جو کہ عصری علوم سے بھی شغف رکھتے ہوں (جنہیں قرآن عالم کہتا ہے) اُن کے تراجم وتفاسیر کو درسی نظام کا حصہ بنایا جائے اور سکول ومدارس میں پڑھایا جائے۔ اسی طرح عربی زبان کو بھی لازمی قرار دیا جانا چاہئے۔ ہر دور میں اس زمانے کے علم کی روشنی میں قرآن پر تدبر کی ضرورت ہے تاکہ قرآن کی حقانیت دنیا پر آشکار ہو اور کائنات میں نظامِ صلوٰۃ قائم ہو۔

## سانحہ ارتحال

کراچی سے آصف جلیل صاحب کی طرف سے ایک ناگہانی اور کربناک اطلاع ملی ہے کہ بزم طلوع اسلام ملیر کراچی کے سرگرم کارکن اور دیرینہ ہمسفر جناب عبدالسلیم خان زادہ صاحب آج صبح اچانک وفات پا گئے ہیں۔ وہ گزشتہ تین سال سے بزم ٹورانٹو کی معاونت سے ویڈیو درس قرآن کے سب ٹائیٹلز پر نہایت انہماک اور دلجمعی سے کام کر رہے تھے ایک سو سے زائد ویڈیوز پر کام مکمل ہو چکا تھا اس فیلڈ میں مدتوں تلاش کے بعد ایک شخص ملا تھا فطرت نے اسے بھی ہم سے یوں واپس لے لیا ہے۔ موت وحیات کا سلسلہ خدا کے اٹل قوانین کا پابند ہے۔ اللہ تعالیٰ انکے درجات کو بلند فرمائے اور انہیں اپنی خاص جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ ادارہ خانزادہ صاحب کے تینوں بیٹوں، بیٹی، زوجہ محترمہ اور دیگر عزیز واقارب کے غم میں برابر کا شریک ہے اور دعا گو ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اس صدمہ کو برداشت کرنے کی ہمت عطا فرمائے۔

# پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 20 روپے علاوہ ڈاک خرچ

| | | |
|---|---|---|
| اسلام آگے کیوں نہ چلا | قرآن مجید کے خلاف گہری سازش | دوقومی نظریہ |
| اسلام کیا ہے؟ | قربانی | عورت قرآن کے آئینے میں |
| اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟ | قیامت موجود | پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں'' |
| اسلام اور مذہبی رواداری | قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں! | کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟ |
| کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟ | قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر | تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود) |
| اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ) | ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟ | کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ |
| اسلامی آئیڈیالوجی | ہندو کیا ہے؟ | بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن |
| اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ) | ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح) | تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں |
| اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں | ہماری تاریخ میں کیا ہے؟ | روٹی کا مسئلہ |
| اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز) | ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟ | جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں |
| انسانیت کا آخری سہارا | ہم عید کیوں مناتے ہیں؟ | نماز کی اہمیت |
| اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری | مقام اقبالؒ | ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی) |
| اقبال کا مردِ مومن | مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم | علماء کون ہیں؟ |
| اندھے کی لکڑی | مرزائیت اور طلوع اسلام | فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں |
| آرٹ اور اسلام | ماؤزے تنگ اور قرآن | کافرگری |
| قرآن کا معاشی نظام | مومن کی زندگی | حرام کی کمائی |
| قرآن کا سیاسی نظام | جہاں مارکس ناکام رہ گیا | عالمگیر افسانے |

# Surah Al-Najm (النجم) – Durus-al-Qur'an: Chapter 2

By G. A. Parwez (Episode No.2)
(Translated by: Mansoor Alam)

**Second part of Mi'raj – meeting with Allah**

Now, take the second phase of the journey. The Prophet (PBUH) went to meet Allah who was sitting on His throne above the seventh heaven. What kind of picture you get my friends from this – Allah, the Almighty, the Creator of heavens and earth, was sitting on a fixed throne to meet the Prophet (PBUH) at a certain time! This brings forth the concept of "space and time." But we know that space and time are related to only material things. This is taught to children in school. The Quran has mentioned again and again that Allah is beyond space and time. It is says: هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۖ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ (57:3) – He is above and beyond time and space. He was the first; and He would be the last. For Him there is no beginning and there is no end. He overpowers everything but His power is invisible and works unperceptively. Law is always invisible and non-physical. However, its results can be perceived; and it may be said that His attributes of creation and Sustenance are the visible manifestations of His Being. His being is invisible to the human eyes. In this way one can say that He is Transcendent and Imminent. He has the knowledge of everything.

Every material thing comes into existence at some point in time and ends at some point in time. If it is present at some place it cannot be present at another place at the same time. Wherever it is, it occupies space. Think about it my friends: that Allah being physically situated in space and time and the Prophet (PBUH) has to physically go there to meet Him? When these facts are brought out in front of those who perpetuate the Mi'raj story, their kneejerk response is that Allah has all the power to do anything. But this is not the question of power. It is the question of what kind of concept emerges of Allah from this story. This is completely against the concept of Allah as presented by the Quran. The Quran says: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ (2:186) – O Messenger! When My devotees ask you about Me, tell them that I am close to them at all times. So much close that: وَنَحْنُ أَقْرَبُ إِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ (50:16) – We are closer to him than his jugular vein. And: وَهُوَ مَعَكُمْ أَيْنَ مَا كُنتُمْ (57:4) – He is with you wherever you may be. Consequently, Allah was with the Prophet (PBUH) all

the time. So, Allah being situated in a particular place is completely a wrong concept of Allah. As Iqbal says:

*O Preacher! You have made God sit on a physical throne!*
*What kind of God is He who is alienated from His devotees?*

He is so far away from his servants, that He used special means to carry the Prophet (PBUH) to meet Him. But other human beings cannot! Therefore, how can the life of the Prophet (BUH) serve as a role model for humans if that is the case?

Leave aside others, even such a great Prophet as Musa (PBUH) who wanted to see God was told: لَّا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ (6:103) – No human vision can encompass Him. Human vision can see only material things. But God is beyond material attributes.

**Crooked arguments to justify going to heavens to meet Allah**

My dear friends, all kinds of crooked arguments are presented to justify the story of Mi'raj beyond the familiar rhetoric that "Allah has power to do anything." When airplanes started flying then the proponents of status quo started saying: look if ordinary human beings can fly into the sky, then God, the possessor of infinite might, can't He make the Prophet (PBUH) reach the heaven using ladder. When astronauts travelled to the moon then these traditionalists started saying that if these astronauts can go to the moon then how come our Prophet (PBUH), with God's permission, cannot travel to the highest heaven. Allah has all the power to do anything. Well, my friends, it is not the question of power but a question of what concept of God emerges from such stories. The concept that the Quran has given of God, such a concept cannot be found anywhere else.

My dear friends, Quran's concept of God is beyond any material attributes; it is beyond human thought and imagination. If you look at all the religions of the world there is something material involved in God's concept – either in the form of idols; or in the form of avatars; or as son of God; or God carrying a sword, surrounded by angels, descending from lightning clouds to earth, etc. Everywhere else you will find God in of some form of physical form. The Quran's concept of God is the only concept that is beyond any physical form; it is beyond human vision and thought. According to the Quran, He is everywhere wherever you may be; He is closer to you than your jugular vein; He is beyond human comprehension. There exists no physical attribute whatsoever associated with Him; He cannot be confined into space and time. The cooked argument that Allah can do anything because He has all the power is nothing more than whitewash and an escape mechanism from facing the realities of the Quran.

My dear friends, I felt it necessary to provide you the necessary backdrop before starting Surah Al-Najm, because this Surah along with the first verse of Surah 17 is presented in regards to the traditional view of what is labeled "Isra-wal-Mi'raj" – that the Prophet (PBUH) went from the Masjid in Makkah to the Masjid Aqsa in Jerusalem on Buraq; and from there to meet Allah to the seventh heaven who was sitting on His throne there. The Prophet (PBUH) received وحی (Wa'hi -Revelation) from Allah for 23 years; He was sending instructions and commands to the Prophet (PBUH) to establish His Deen. There is nothing in Surah Al-Najm about Prophet (PBUH) going anywhere, let alone going to Masjid Aqsa or visiting the heavens to meet Allah. When the Prophet (PBUH) was in constant touch with Allah then why would Allah ask him to come to the heavens to receive the gift of 50 prayers and to receive the last two verses of Surah Baqarah? The entire Quran was revealed to the Prophet (PBUH) by Allah. Why would Allah specially ask him to come to the heaven to receive the last two verses of Surah Baqarah?

**Meaning of نبی (Nabi)**

As I mentioned we have wrong concept of نبی (Nabi) – that is borrowed from Judaism. To Jewish people a نبی (Nabi) was one who made prophesies. The head priest in their temple used to occupy high status because he predicted future and foretold people's kismet. According to Arabic root meaning of نبی (Nabi) is one who stands on a high pedestal; one who is in touch with this world of human beings, and in touch with Allah as the recipient of his revelation. The first two verses of Surah Al-Najm shed a great light on this high position of the نبی (Nabi) in extraordinary unique style encompassing both this world as well as the other world: وَالنَّجْمِ إِذَا هَوَىٰ ﴿١﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوَىٰ (53:1-2).

My dear friends, Surah Al-Najm presents the high status of نبی (Nabi). We will take up these verses in the next lecture.

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ

*O our Sustainer! Accept our humble efforts because you are fully aware of what we speak and what is hidden in our hearts. (2:127)*

**Matrimonial**

Female, Age: 30, Height: 5.2, Caste: Jutt, Residence : Lahore - Pakistan, School: Crescent Model, Education: MBA, Profession: Banker (Management Information Systems and Operations department). Marital status : Single-never married. Ethnicity: Pakistani

**Family:** Father :(retired-used to work for Iteffaq Textiles as Import & Export Manager), Mother : Housewife, Two elder brothers-both married.

Language: Urdu, English, Punjabi.

Contact Person: Father: 03214593353, Brother: 03004170096

رسول اللہ ﷺ کے زمانہ میں رائج تھا۔ یعنی قرآن کریم کے احکام وقوانین کی اطاعت اور جن امور میں قرآن کریم نے صرف اصول دیئے ہیں ان کی چار دیواری کے اندر امت کے مشورہ سے متعلقہ امور کے فیصلے۔ اس طریق کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔

8- بدقسمتی سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے بعد منقطع ہو گیا اور دین کا نظام باقی نہ رہا۔ اس سے امت میں انتشار پیدا ہو گیا۔ خلافت کے زمانے میں تمام امور دین کے نظام کے تابع رہتے تھے۔ لیکن بعد میں مذہب اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری ہے۔

9- ہمارے لئے کرنے کا کام یہ ہے کہ پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا سلسلہ قائم کیا جائے جو امت کو احکام وقوانین خداوندی کے مطابق چلائے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو مرکز ملت کہا جائے گا اور اس کی طرف سے جاری شدہ احکام کی اطاعت خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کے قائم مقام قرار پائے گی۔ ظاہر ہے کہ اس نظام کو چلانے والوں کی اپنی زندگی سب سے پہلے قوانین خداوندی کے تابع ہوگی۔

10- چونکہ دین کا نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا' اس لئے اس میں موجودہ ثنویت ختم ہو جائے گی۔ یعنی اس میں یہ نہیں ہوگا کہ سیاسی معاملات کے لئے حکومت کی طرف رجوع کیا جائے اور مذہبی یا شخصی امور کے لئے مذہبی پیشوائیت کی طرف۔ اس میں یہ دونوں شعبے باہم گڈمڈ ہو جائیں گے۔

11- جب تک اس قسم کا نظام قائم نہیں ہو جاتا' امت کے مختلف فرقے جس جس طریق پر نماز' روزہ وغیرہ اسلامی احکام پر عمل کر رہے ہیں' کسی کو حق نہیں پہنچتا کہ ان میں کوئی رد و بدل کرے یا کوئی نیا طریقہ وضع کر کے اسے ''خدا اور رسول ﷺ'' کا طریقہ قرار دے۔ یہ حق قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کو پہنچتا ہے کہ وہ رفتہ رفتہ امت کے اختلافات کو مٹا کر اس میں وحدت پیدا کرے۔

12- قرآنی نظام کا مقصود یہ ہے کہ خدا کی متعین کردہ مستقل اقدار کے مطابق انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہوتی جائے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ یہ نظام تمام افراد معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی' روٹی' کپڑا' مکان' علاج' تعلیم وغیرہ بہم پہنچانے کا ذمہ دار ہو۔

13- قرآن کا نظام اپنی نوعیت کا واحد اور منفرد نظام ہے اس لئے نہ وہ دنیا کے کسی اور نظام میں جذب ہو سکتا ہے نہ ان سے مفاہمت کر سکتا ہے۔ خواہ وہ مغرب کا جمہوری سرمایہ دارانہ نظام ہو' یا سوشلزم کا آمرانہ اشتراکی نظام۔ اس کے نزدیک یہ سب نظام ہائے زندگی غیر خداوندی ہیں لہٰذا باطل۔

14- جہاں تک احادیث کا تعلق ہے ہم ہر اس حدیث کو صحیح سمجھتے ہیں جو قرآن کریم کے مطابق ہو' یا جس سے حضور نبی اکرم ﷺ یا صحابہ کبارؓ کی سیرت داغدار نہ ہوتی ہو۔

15- ہم' رسول اللہ ﷺ کے بعد' ہر قسم کے مدعی وحی کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔

16- طلوع اسلام کا تعلق نہ کسی سیاسی پارٹی سے ہے نہ مذہبی فرقہ سے (اسے فرقہ اہل قرآن سے بھی کوئی تعلق نہیں)' نہ ہی یہ کوئی نیا فرقہ پیدا کرنا چاہتا ہے اس لئے کہ اس کے نزدیک دین میں فرقہ سازی شرک ہے۔ امت کے مختلف فرقے جس طریق سے نماز' روزہ وغیرہ کی ادائیگی کرتے ہیں' ہم ان میں کسی قسم کا ردوبدل نہیں کرتے۔ ہم صرف قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرتے ہیں تاکہ کسی طرح پھر سے قرآنی نظام (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کا قیام عمل میں آ سکے۔ یہ ہے ہمارا مقصد' جسے ہم برسوں سے دہراتے چلے آ رہے ہیں۔

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL.73
ISSUE
07

Monthly
# TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com
www.facebook.com/talueislam/

## فکرِ قرآنی کے لئے پرویزؒ سند نہیں

''میں اپنی بصیرت کے مطابق قرآنی فکر پیش کرتا ہوں۔ آپ کے لئے ضروری ہے کہ آپ از خود قرآنِ کریم پر غور و فکر کے بعد فیصلہ کریں کہ میری فکر صحیح ہے یا نہیں۔ اسے اچھی طرح سن رکھئے کہ جس دن آپ نے دین کے معاملہ میں قرآنِ کریم کی بجائے کسی انسان کو سند مان لیا، آپ نے فرقہ بندی کی بنیاد رکھ دی اور یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ فرقہ پرستی قرآن کی رُو سے شرک ہے۔''

(غلام احمد پرویز، طلوعِ اسلام اپریل 1960ء)